Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1965

جشنِ قرآن العظیم نمبر

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ — لاہور

بدلِ اشتراک
پاک و ہند سے
سالانہ ——— دس روپے
غیر ممالک سے
سالانہ ——— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاک و ہند سے
ایک روپیہ

ٹیلیفون ۸۰۰۸۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

جلد ۱۸ — ستمبر ۱۹۶۵ء — نمبر ۹

فہرستِ مضامین

لمعات ——— ۲
نعت فی دعمیر ——— (دنیا میں اسلام یوں پھیلے گا) ——— ۹
رابطہ باہمی ——— ۱۱
جشنِ قرآن العظیم ——— (صفدر سلیمی) ——— ۱۳
استقبالیہ ——— (شیخ سراج الحق صاحب سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ——— ۲۵
نوید حیات ——— (محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ) ——— ۲۸
اب بات سمجھ میں آئی ——— (محترمہ رشیدہ صلاح الدین صاحبہ) ——— ۳۵
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ——— محترم ظفر عباس ترمذی صاحب) ——— ۳۶
میرے تاثرات ——— (چوہدری محمد اشرف صاحب) ——— ۴۰
پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن ——— (راجہ محمد اکرم صاحب ایڈووکیٹ) ——— ۴۲
منزل نمل ۔ مقام ملا ۔ مدعا ملا ——— (محترمہ مس شمیم انور صاحبہ) ——— ۴۸
میں نے اس درس سے کیا حاصل کیا ——— (ڈاکٹر سید محمد ودود صاحب) ——— ۵۶
تذکرہ اور تاثر ——— (مرزا محمد خلیل صاحب) ——— ۶۳
باب المراسلات ——— (اطاعت کا مفہوم) ——— ۷۶
بچوں کا صفحہ ——— (آزادی) ——— ۸۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۱۴ اگست کو ہم نے اپنی آزادی کی اٹھارویں سالگرہ منائی۔ قوموں کی زندگی میں ان کا یوم آزادی ایک عظیم اور ناقابل فراموش تاریخی واقعہ ہوتا ہے جسے نہایت تزک و احتشام سے منانا چاہیئے۔ یوم آزادی کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب نبی اکرمؐ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ یہودی یکم محرم کا روزہ رکھتے ہیں آپؐ کے دریافت فرمانے پر انہوں نے کہا کہ اس دن بنی اسرائیل کو فرعون کی محکومی سے آزادی نصیب ہوئی تھی اس لئے ہم اس کی یاد میں اس دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم بھی اس جشن مسرت میں یہودیوں کے ساتھ شریک ہو اور اس دن کا روزہ رکھو کیونکہ کسی قوم کی آزادی صرف اسی قوم کے لئے باعث مسرت نہیں ہوتی پوری انسانیت کے لئے وجہ انبساط ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ایک مظلوم انسان کا ظالم کے پنجۂ استبداد سے چھوٹ جانا ہی کچھ کم خوشی کا موجب نہیں ہوتا چہ جائیکہ انسانوں کی ایک عظیم جماعت کا دوسرے انسانوں کی محکومی سے آزاد ہو جانا! لہٰذا ہم اپنے یوم آزادی کی تقریب پر جسقدر مسرت و شادمانی اور بحضور رب العزت جسقدر جذبات تشکر و امتنان کا اظہار کریں کم ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک حمدا کثیرا۔

پاکستان کی عمر جوں جوں بڑھتی جا رہی ہے تحریک پاکستان کی اہمیت اسی قدر زیادہ اجاگر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ تحریک پاکستان کا جذبہ تو ہمارا دینی تقاضا تھا۔ اسلام کی رُو سے مسلمان ایمان کے اشتراک کی بنا پر دنیا کے ہر غیر مسلم سے الگ ایک مستقل قوم ہیں۔ اور اسلام کا بحیثیت نظام حیات اسی صورت میں احیاء ہو سکتا ہے جب اس کے ماننے والوں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ دین کا یہی تقاضا مطالبہ پاکستان کا جذبۂ محرکہ تھا۔ اس تقاضا کے برسرحق اور ہمارے اس فیصلہ کے مستحسن ہونے کے لئے ہمیں نہ کسی خارجی شہادت کی ضرورت تھی (نہ ہے) اور نہ ہی ستر قبل کے واقعات سے اس کے لئے سند جواز لانے کی حاجت۔ لیکن مسلمانوں کا جو گروہ اس تحریک کی مخالفت کرتا تھا ــــ اور طرفہ تماشا یہ کہ یہ گروہ حضرات علماء کرام پر مشتمل تھا جن کے سرخیل مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) اور مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) جیسے امام الہند اور شیخ الحدیث تھے ــــ ان کا کہنا یہ تھا کہ آزاد متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت

جداگانہ مملکت کے مقابلہ میں' زیادہ اچھی رہے گی۔ وہ تو یہاں تک بھی کہتے تھے کہ پاکستان' ہندوستان سے الگ ہو کر' ایک دن کے لئے بھی اپنے قدموں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ وہ اس اقدام کو مسلمانوں کی اجتماعی خودکشی سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ باقی رہا مذہب' سو اس کے متعلق وہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں "کامل مذہبی آزادی" ہو گی۔ انہیں نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کی ادائیگی سے کوئی نہیں روکیگا۔ یہ حضرات' اسلام کو بھی ایک مذہب ہی سمجھتے تھے جس پر کاربند ہونے کے لئے اپنے جداگانہ نظام —— حتٰکہ کسی نظام۔ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جہاں تک ان لوگوں کے اس دعوے کا تعلق ہے —— کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت زیادہ اچھی ہو گی' اس کی تردید' اس اٹھارہ برس کے واقعات اس شد و مد سے کرتے چلے آ رہے ہیں کہ اسے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد' مغربی پاکستان کی آبادی کے برابر ہے۔ ایک اقلیت کی اتنی کثیر تعداد کچھ کم مؤثر نہیں ہوتی۔ لیکن وہاں کے مسلمانوں کی جو حالت ہے وہ کسی کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ اس وقت "تک" کم از کم پانچ چھ لاکھ کے قریب مسلمان وہاں سے زبردستی پاکستان کی طرف دھکیل دیئے گئے ہیں۔ یہ وہ دھاندلی ہے جسے آج تک کسی مہذب قوم نے اپنی اقلیت کے ساتھ روا نہیں رکھا۔ جو مسلمان ابھی تک وہاں موجود ہیں ان کی زندگی کی کوئی متاع —— جان۔ مال۔ عزت' عصمت' حتٰکہ ان کی مذہبی عبادت گاہیں' ان کے اسلاف کی قبروں تک میں سے کوئی شے بھی —— محفوظ نہیں۔ وہ یکسر اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی حالت شودروں سے بھی بدتر ہے۔ ان کی کسی متاع حیات کا محفوظ رہنا تو ایک طرف' ہندو اتنا بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کا جداگانہ نام تک بھی باقی رہے۔ اگلے دنوں یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی کہ ان کے "محققین" یہ ثابت کر رہے ہیں کہ تاج محل اور قطب کی لاٹھ' مسلمانوں کی آمد سے بہت پہلے' ہندوؤں نے تعمیر کئے تھے اور مسلمانوں نے ان پر غاصبانہ قبضہ کر لیا —— شاید اب دہلی کی جامع مسجد اور درگاہ حضرت نظام الدینؒ کے متعلق بھی اسی قسم کی "تحقیق" جاری ہو۔ اور آگے بڑھئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نظم و نسق تو پہلے ہی انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اب ایک آرڈی نینس جاری کیا گیا ہے کہ اس سے "مسلم" کا لفظ ہٹا دیا جائے کیونکہ اس سے فرقہ پرستی کی بو آتی ہے۔ اس پر وہاں بڑا ہنگامہ ہوا۔ عدالت تک کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ ہر قسم کی چارہ جوئی کی گئی۔ لیکن بے سود۔ اب وہ آرڈی نینس' قانون میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی متحدہ قومیت

ہیں، مسلمانوں کی حیثیت کیا ہے' اس کا اندازہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کے ایک حالیہ بیان سے لگائیے۔ تمہیداً یہ سُن لیجئے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان وہ ہیں کہ جب ۱۹۲۵ء میں مولانا محمد علی جوہر (مرحوم) نے، اپنے نیشنلزم کے زمانے میں' تحریک ترکِ موالات کے سلسلہ میں، علی گڑھ یونیورسٹی کے بائیکاٹ کی تحریک شروع کی' تو ڈاکٹر صاحب طلباء کا پہلا گروہ ساتھ لے کر وہاں سے نکلے اور اس طرح جامعہ ملیہ کا آغاز ہوا۔ وہ شیخ الجامعہ رہنے اور اب مملکتِ ہندوستان کے نائب صدر ہیں۔ ان کا نائب صدر بنا دیا جانا' اتنا بڑا "معرکہ" ہے کہ ہندو اسے اپنی کشادہ ظرفی اور مسلم اقلیت کے ساتھ حسنِ سلوک کی تائید میں دنیا بھر میں ببانگِ دھل پیش کرتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی متحدہ قومیت میں ان کی حیثیت کیا ہے اس کے متعلق انہوں نے پچھلے دنوں ہندوستان ہی میں ایک بیان دیا تھا جس میں کہا تھا کہ ہندو ابھی تک مسلمانوں کو ہندوستانی قوم کا جزو نہیں سمجھتا۔ چنانچہ (انہوں نے کہا کہ) جب انتخابات ہوئے تو (اور تو اور) مولانا ابوالکلام آزاد تک کو اپنے علاقہ سے بطور امیدوار کھڑا کرنا پڑا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یعنی ہندوؤں کی اکثریت تو ایک طرف' ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ آبادی سے بھی ان کا کامیاب ہونا ناممکن تھا۔ اس لئے انہیں مجبوراً ایسے علاقہ سے کھڑا کیا گیا جہاں وہ مسلمانوں کی کثرتِ آراء سے کامیاب ہو سکیں۔ یہ حالت تھی مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی جنہوں نے اپنی متاعِ دین و دانش کے بارے میں —— رفتم و نثارِ بت پرستے کردم۔ پر عمل کر کے دکھا دیا تھا۔ اور اس کی تائید و تصدیق کرنے والے ہیں ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب جنہیں بھارت کا وائس پریذیڈنٹ بنایا ہوا ہے۔ ہندوؤں کے اسی سلوک کا نتیجہ ہے کہ وہاں کے وہ مسلمان لیڈرز جو متحدہ قومیت کے ستون اور نیشنلسٹ طبقہ کے سرخیل تھے' اب مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کے لئے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں اور ڈاکٹر سید محمود جیسے کٹر کانگریسی راہ نما اور جمعیت العلماء جیسی متشدد "مخالفِ تقسیم" جماعت' اس کوشش میں پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔

یہ ہے مختصراً ہندوستان کی مسلم اقلیت کی حالت' زبون و زار' ہندو اکثریت کے ہاتھوں۔ ہم پوچھتے ہیں ان کانگریسی مسلمانوں سے جو کہا کرتے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت' اپنی آزاد مملکت کے مقابلہ میں' زیادہ اچھی ہو گی —— اور خود پاکستان

میں بھی ان لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں جو ایسا کہا کرتے تھے۔ اور ان میں بعض تو اب تک باحسرت کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے جداگانہ مملکت کیوں بنائی! —— کہ کیا یہی تھی مسلمانوں کی وہ حالت جسے دیکھنے کے لئے وہ تحریکِ پاکستان کی مخالفت کیا کرتے تھے؟ جب ان لوگوں کو اور کوئی جواب نہیں سوجھتا تو (بڑی ڈھٹائی سے) کہہ دیتے ہیں کہ وہاں کے مسلمانوں کی یہ حالت اس لئے ہوگئی کہ پاکستان کے مسلمان ان سے الگ ہوگئے۔ اگر ہم سب متحدہ ہندوستان میں رہتے تو ہماری حالت ایسی کبھی نہ ہوتی! ان سے پوچھئے کہ ان کے پاس ایسا کہنے اور سمجھنے کے لئے دلیل کیا ہے؟ جداگانہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت کی تعداد چار پانچ کروڑ کے قریب ہے۔ متحدہ ہندوستان میں ان کی تعداد تیرہ چودہ کروڑ ہو جاتی۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا؟ کیا یہ اس طرح وہاں اکثریت میں تبدیل ہو جاتے؟ جمہوری نظام میں پچیس تیس کی اقلیت تو ایک طرف اُنچاس (۴۹) کی اقلیت بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اور پھر اقلیت بھی سیاسی نہیں کہ جس کے اکثریت بن جانے کے امکان ہر وقت کھلے ہوتے ہیں۔ اقلیت 'مذہبی' جو اُس وقت تک اکثریت بن جانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی جب تک اکثریت (ہندوؤں) کے اتنے افراد اپنا مذہب تبدیل کر کے مسلمان نہ ہو جائیں کہ ان کی تعداد 'اکثریت بن جائے'۔ کیا ہندوستان میں، مسلمانوں کے اس طرح اکثریت بن جانے کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ اور جب تک وہ اقلیت میں ہیں —— خواہ وہ اقلیت پچیس فی صد کی ہو یا تینتیس فی صد کی —— ہندو کی تنگ نظری سے کسی قسم کے عادلانہ سلوک کی توقع کی جا سکتی ہے؟ کیا یہ ہم آٹھ نو کروڑ کی خوش بختی نہیں ہم اس قسم کی (SADISM[1]) کی ذہنیت رکھنے والی قوم کے پنجۂ آہنی کی گرفت سے بچ کر نکل آئے! اگر حالات مساعد رہتے تو حکومتی سطح پر تبادلۂ آبادی سے ہم باقیماندہ مسلمانوں کو بھی ادھر لا سکتے تھے۔ لیکن یہ حالات موجودہ اس قوم کے چنگل سے ۶۰ فی صد حصہ کا محفوظ کر لینا کچھ کم معرکہ آرا اقدام ہے؟ ۔ لہٰذا ہمارا ہر فرد ان دوراندیش، انتہائی مشفق اور محسن راہ نمایانِ ملت کا (جن میں سرسید کے بعد علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے اسمائے گرامی سرِ فہرست آتے ہیں) شکر گزار ہے جنہوں نے بکمالِ حسن تدبر ہماری حفاظت کا سامان بہم پہنچا دیا۔ اور ہماری گردن جھک جاتی ہے ان لاتعداد مجاہدین کی تعظیم کے لئے

---

[1] جو دوسروں کو اذیت پہنچا کر خوش ہو۔

جنہوں نے کسی نہ کسی جہت سے اس مقصد (حصولِ پاکستان) کے لئے جدوجہد کی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

جب تک پاکستان قائم ہے ——— خدا اسے ابد الآباد تک قائم رکھے ——— یہاں کے مسلمان ان کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

پھر یہی نہیں کہ ہندوؤں نے وہاں کے مسلمانوں ہی کو ستایا ہو۔ انہوں نے پاکستان کے مسلمانوں کو بھی تنگ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جب حضرت موسےؑ نے فرعون سے جا کر کہا کہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم خدا کے بندوں (بنی اسرائیل) کو میرے ساتھ جانے دو کہ میں ان کے لئے خدا کی سرزمین میں آزادی کا سانس لینے کا انتظام کر دوں، تو بظاہر اس میں فرعون کا کچھ نقصان نہیں تھا۔ لیکن وہ اس پر کسی صورت میں بھی رضامند ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے کہ حاکم قوم، خود اپنی قوم پر حکومت کر نہیں سکتی۔ اسے حکومت کرنے کے لئے غیر قوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر وہ غیر قوم کو اپنی سرزمین سے نکل جانے کی اجازت دیدے تو وہ حکومت کس پر کرے؟ ہندو بھی اسی ذہنیت کا حامل ہے۔ اسے حکومت کرنے کے لئے ایک غیر قوم (مسلمانوں) کی ضرورت تھی ——— صرف حکومت کرنے کے لئے ہی نہیں بلکہ اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لینے کے لئے بھی ——— وہ مسلمانوں کو اپنے پنجۂ استبداد سے نکل جانے کی اجازت کب دے سکتا تھا۔ چنانچہ پاکستان بن جانے کے بعد بھی اس کی انتقامی خواہش اور کوشش یہی ہے کہ یہ مملکت پھر سے ہندوستان کا جزو بن جائے۔ اس کے لئے وہ ہر ممکن حربہ استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔ تقسیمِ ہند کے وقت عام قتل و غارت گری، مشترکہ اثاثہ کے بٹوارے میں ہر قسم کی حیل و حجت اور نہایت غیر معقول رویہ۔ دریاؤں کے پانی کی تقسیم اور استعمال کے سلسلہ میں، پاکستان کی رگِ حیات کاٹ دینے کی سعیٔ مذموم، کشمیر کا مسئلہ۔ اور ان تمام (خود پیدا کردہ تنازعات کے سلسلہ میں) نہ کسی عہد کی پابندی نہ معاہدہ کا احترام۔ نہ کسی بات کا پاس، نہ قول و اقرار کا لحاظ ——— طے شدہ معاملات تک سے پھر جانے کی مذموم روش اور فیصلہ شدہ امور میں از سرِ نو جھگڑے نکالنے کی خوئے بد۔ لَا یَرْقُبُوْا فِیْکُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّۃً۔ نہ کسی قول اقرار کا پاس۔ نہ ذمہ داریوں کا احساس۔ یُرْضُوْنَکُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰی قُلُوْبُهُمْ (۹/۸) زبانی باتوں سے تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں اور دل سے ان باتوں کا انکار کرتے ہیں۔ لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا۔ یہ تمہاری تخریب میں کوئی کمی

نہیں کرتے۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۔ یہ دل سے چاہتے ہیں کہ تم کسی خطرناک مصیبت میں پڑ جاؤ۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ۔ تمہارے خلاف بغض و نفرت، ان کی بعض باتوں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (۳/۱۱۸)۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ ہے وہ قوم جس سے ہمیں سابقہ پڑا ہے۔

پھر ان کے ساتھ مغربی طاقتوں کا بھی تقاضا یہی ہے کہ پاکستان کمزور رہے۔ اسی لئے وہ ہر متنازعہ فیہ مسئلہ میں، حق و انصاف کے ہر تقاضا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، ہمارے خلاف جاتے ہیں اور ہندوستان کی مدد کرتے ہیں۔ انگریز نے خود تقسیم کے وقت ہم سے جو غداری کی وہ کسی سے چھپی نہیں۔ یہ اسی کے نتائج و عواقب ہیں جو ہمیں کسی پہلو چین نہیں لینے دیتے۔ ادھر، امریکہ جو کچھ ہمارے ساتھ کر رہا ہے وہ بھی زیر نقاب نہیں رہا۔ دوسری طرف وہ ہندوستان کو جس قدر فوجی امداد دے رہا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ اس سے ہندوؤں کے حوصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔

ان حالات میں، پاکستان کا ان کے ہاتھوں نہ صرف محفوظ رہ جانا، بلکہ جہاں جہاں ان سے دست بدست جھڑپیں ہوئی ہیں، وہاں اپنی قوت کا سکہ بٹھا دینا، کچھ کم تعجب انگیز اور ہمت افزا نہیں۔ جن لوگوں نے کسی انداز سے بھی پاکستان کے تحفظ اور استحکام میں حصہ لیا ہے، ہم ان کے شکر گذار ہیں، ہمارا ان کی تعظیم کے لئے خم ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم ایک اہم گذارش اپنی قوم کی خدمت میں بھی کرنا چاہتے ہیں، قومیں نہ تو اپنے شاندار ماضی کی یاد کے تحفظ سے زندہ رہتی ہیں۔ اور نہ ہی اپنے حال سے مطمئن ہو جانے کی بنا پر۔ قومیں زندہ رہتی ہیں مستقبل (FUTURE) کے لئے ایک نصب العین سامنے رکھنے اور اس کے حصول کے لئے جد و جہد کرنے سے۔ ماضی کی یاد اس لئے ضروری ہوتی ہے کہ اس تجربہ کو ہم اپنے مستقبل کی تعمیر میں کام لائیں۔ اور حال کا قابل اطمینان ہونا اس لئے ضروری ہے تاکہ ہم اسے آگے بڑھا کر مستقبل تک لے جائیں۔ یہ صرف مستقبل کا مقصد ہے جس کے لئے زندہ قومیں لڑتی اور

مرتی ہیں۔ یہی وہ وحدتِ مقصد ہے جس سے قوم میں یک جہتی پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ قوم کہا ہی ان افراد کے مجموعے کو جائے گا جو وحدتِ مقصد کے رشتے سے بندھے ہوں۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو کوئی قوم کسی ایک وقت قوم بن کر ہمیشہ کے لئے قوم نہیں بنی رہتی۔ اگر کسی قوم کے سامنے ایک وقت میں مستقبل کا کوئی مقصد ہے اور دوسرے وقت وہ مقصد آنکھوں سے اوجھل ہوگیا ہے، تو اس دوسرے وقت میں وہ قوم، قوم نہیں رہے گی۔ محض افراد کا ہجوم یا ابنوہ رہ جائے گا۔ اسی لئے رینان نے کہا تھا کہ قوم کو قوم رہنے کے لئے "روزانہ استصواب" (DAILY PLEBISCITE) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے محاسبہ خویش کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے ایمان بالآخرت پر جو اس قدر زور دیا ہے تو اگرچہ اس "آخرت" میں مرنے کے بعد کی زندگی بھی شامل ہے، لیکن اس سے اسی دنیا میں مستقبل کا مقصد خارج نہیں۔ اللہ پر ایمان، ہمیں زندگی کا نصب العین عطا کرتا ہے — یعنی صفاتِ خداوندی کو بطور مستقل اقدار سامنے رکھنا۔ اور آخرت پر ایمان، اس نصب العین کے حصول کو زندگی کا مدعا بناتا ہے۔ اسی سے مؤمن (یعنی اس طرح ایمان لانے والے) ایک زندہ قوم کے افراد بنتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے اس نصب العین کو اپنا مقصودِ زندگی بنایا ہے، اور اس کا حصول ہماری سعی و کاوش کا منتہیٰ ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر ہمارا شمار زندہ قوموں کے زمرے میں ہوسکتا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر ہم ہجوم مرد ماں تو کہلا سکتے ہیں، قوم کے افراد نہیں کہلا سکتے۔

کیا ہم اپنے ہاں اس استصواب رائے (PLEBISCITE) پر پورے اترتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر پاکستان کے ایک ذرۂ خاک کی طرف بھی کوئی ٹیڑھی نگاہ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کرسکتا — حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاق۔

حقائق و عبر

دنیا میں اسلام یوں پھیلے گا

موقر جریدہ الاعتصام سے قارئین طلوع اسلام اچھی طرح متعارف ہیں۔ یہ جمعیت اہل حدیث کا ترجمان ہے جن کا مسلک خالص سنتِ رسول اللہ کا اتباع اور اسی کی نشر و اشاعت ہے۔ بدعت اور توہم پرستی کے یہ حضرات سخت مخالف ہوتے ہیں (یا کم از کم اس کا دعوےٰ کرتے ہیں) اس جریدہ کی ۹ راگست کی اشاعت میں "صفحہ اول پر" درس حدیث" کے زیر عنوان حسب ذیل واقعہ درج ہے۔

ایسا ہی ایک قصہ عوام بن حوشب سے مروی ہے وہ کہتے ہیں، "میں ایک دفعہ ایک قبیلہ کے ہاں مہمان ٹھہرا اس کے قریب ہی ایک قبرستان تھا، میں نے دیکھا اس قبرستان کی ایک قبر سے عصر کے بعد روزانہ ایک مردہ نکلتا ہے جس کا سر گدھے کا اور بدن انسان جیسا ہے۔ گدھے کی سی تین آوازیں نکالتا پھر قبر میں جاکر محبوس ہو جاتا ہے۔ قریب ہی ایک بڑھیا، سوت وغیرہ کات رہی تھی، مجھ سے ایک عورت کہنے لگی، آپ جانتے ہیں یہ بڑھیا کون ہے۔؟ میں نے کہا، کیوں کیا بات ہے۔؟ کہا یہ اس قبر سے نکلنے والے کی ماں ہے، یہ شخص شراب پیا کرتا تھا، یہ بے چاری بڑھیا اس کو روکتی اور کہتی تھی، اللہ سے ڈر، کب تک شراب پیئے جائے گا۔؟ یہ کہتا تھا تو تو گدھے کی طرح آواز نکالتی رہتی ہے (کرنا خدا کا یہ ہوا کہ) یہ ایک دن عصر کے بعد مر گیا، اب ہر دن عصر کے بعد یہ قبر پھٹتی ہے، یہ باہر نکلتا ہے اور تین بار گدھے کی آوازیں کرکے قبر میں بند ہو جاتا ہے۔"

دوسری طرف پاکستان ٹائمز کو لیجئے جو (انگریزی زبان کا اخبار ہونے کی وجہ سے) بہرحال ماڈرن طبقہ کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ۸ راگست کی اشاعت میں' سلہٹ کے ایک بزرگ'

حضرت شاہ جلال رحؒ کے سوانح حیات شائع ہوئے ہیں، اس ضمن میں لکھا ہے۔

جب یہ بزرگ اپنے تین سو ساٹھ رفقاء کے ساتھ جو خود بھی ولی اللہ تھے، دریا کے کنارے پہنچے تو دیکھا کہ راجہ نے (جو ان کا مخالف تھا) تمام کشتیاں جلا دی تھیں۔ انہوں نے اپنے جائے نماز دریا کے پانی پر بچھا دیئے اور ان کے اوپر سے گذرتے ہوئے دریا پار کر لیا۔

اس کے بعد ان کے مؤذن نے اذان دی، تو راجہ کا محل، جو سات منزلوں کا تھا، ایک دم نیچے گر کر مسمار ہو گیا۔

اس طرح سلہٹ میں اسلام پھیلا۔

معلوم نہیں اب والدین کے ساتھ گستاخی سے پیش ہونے والوں کی قبریں کیوں نہیں پھٹتیں اور اب دریاؤں کو پیادہ عبور کرنے والے، اور اپنی اذانوں سے راجاؤں کے محلات گرا دینے والے کہاں چلے گئے! اگر یہ اب بھی کہیں سے آنکلیں تو امت بیچاری کی ہزار مشکلیں آسان ہو جائیں اور دنیا میں اسلام کا غلبہ نہایت آسانی سے ہو جائے۔

لیکن اب اس قسم کی داستانیں دہرانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کا تھوڑا بہت احترام ہوتا ہے، وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابیں آپکو گھر بیٹھے باقاعدگی سے ملتی رہیں اور آپ ڈاک خرچ سے بھی بچ جائیں تو اس کے لئے ادارہ کے

پیشگی خریدار بن جائیے

ایک سو روپے یکمشت یا پچیس پچیس روپے کی چار ماہانہ قسطوں کی ادائیگی سے آپ ادارہ کے پیشگی خریداروں میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں ہر مطلوبہ کتاب آپکو بلا خرچ ڈاک باقاعدگی سے مہیا کیجاتی رہیگی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام،
۲۵۔ بی گلبرگ ۔ لاہور

رابطہ باہمی

(بزمہائے طلوع اسلام کی ماہانہ رپورٹیں)

لاہور جشن میلاد النبیؐ اور جشن قرآن العظیم کی مبارک تقریب کی شاندار سرانجام دہی کے بعد اراکین بزم قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں کامیابی سے اپنے قدم آگے بڑھا رہے ہیں۔ طلوع اسلام کالج فنڈ کی فراہمی کیلئے انکی سرگرمیوں کا سلسلہ منظم طور پر جاری ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ طلوع اسلام سالانہ کنونشن کی تیاری میں بھی اپنے فریضہ کی ادائیگی کیلئے آغاز کار کر چکے ہیں۔ اس کنونشن میں انہیں میزبانوں کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ حیثیت ہر سال ان کیلئے بھاری ذمہ داریاں لیکر آتی ہے۔ چنانچہ اراکین بزم کو اپنی ان ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس ہے اور انکی کوشش یہ ہے کہ اس سال کنونشن سالہائے گذشتہ سے بڑھ چڑھ کر کامیاب ہو۔ خدا ان کی پاکیزہ آرزوؤں اور کوششوں کو بار آور فرمائے۔

کراچی ۔ کوئٹہ سب کنونشن سے واپسی کے بعد یہاں کے ارکان نے طلوع اسلام کالج کے سلسلے میں سرگرمی کی جدوجہد پورے نظم و ضبط اور کامیابی سے شروع کی ہے۔ اس جدوجہد کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ہیں۔ بزم نے مرکز کو ایک نیا ٹیپ ریکارڈر بھی تحفتہً پیش کیا ہے پرویز صاحب کے درس قرآن کریم کا سلسلہ بذریعہ ٹیپ کامیابی سے جاری ہے اور اسے مزید کامیاب بنانے کیلئے مقامی اخبارات میں نمایاں طور پر اسکا اعلان شائع ہوتا ہے شہر کے اہم مقامات پر اس سلسلے میں عنقریب بڑے بڑے بورڈ بھی نصب کئے جا رہے ہیں۔ لٹریچر کی تقسیم بھی باقاعدگی سے ہو رہی ہے۔ اور درس کے موقع پر ادارہ کی مطبوعات کا سٹال بھی لگایا جاتا ہے۔

پشاور ۔ بزم پشاور کے نمائندہ مرزا علی احمد جان مرحوم کی رحلت پر اظہار تعزیت کے سلسلے میں مرحوم کے دولتکدہ پر ۸۔ اگست کو احباب کا ایک خصوصی اجتماع ہوا۔ مردان، پشاور صدر، چارسدہ، نوشہرہ اور نواں کلی کی بزموں کے احباب نے اس اجتماع خصوصی میں شرکت کی۔ اس موقع پر مرزا صاحب مرحوم کے اعزہ و احباب و پسماندگان سے بذریعہ قرارداد مخلصانہ تعزیت اور ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور حسب ضرورت انہیں ممکن خدمات کی پیشکش کی گئی۔ بزم پشاور کی نمائندگی کی ذمہ داری عارضی طور پر مرحوم کے فرزند عزیز مرزا مسعود احمد جان سلمہٗ کے سپرد کر دی گئی اور انہوں نے اسے بخوشی قبول کر لیا۔ احباب کے دوپہر کے کھانے کا انتظام محترم ضیاء صاحب نے اپنے ہاں کیا۔ ادارہ (سابقہ سرحد کے) ان احباب کے ان اقدامات میں ان کا ہمنوا ہے۔

جشن قرآن العظیم

یعنی درس قرآن کریم کے سلسلہ میں نصف اول (پندرہ پارے) ختم ہونے پر بدرگاہ رب العزت سجدۂ شکرانہ کی تقریب سعید جو ۲۵ جولائی ۱۹۶۵ء کو مرکز فکر قرآنی ۲۵ ربی۔ گلبرگ میں منعقد ہوئی۔

روئداد

جشنِ قرآن العظیم

(بقلم صفدر سلیمی)

ساون کی برکھا رت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس دفعہ یہ مہینہ بادلوں اور بارشوں کی روایتی شان لے کر آغاز پذیر ہوا تھا۔ چاروں طرف مطلع آسمان پر جھومتے ہوئے بادل کئی دنوں سے سہانا سماں باندھے چلے آرہے تھے کہ اس سہانے سمے کے آغاز میں ہی اتوار کی وہ خوشگوار صبح آگئی جب معفکر قرآن کے درسِ قرآن کریم کا سلسلۂ دراز پندرہ پاروں کے اختتام تک پہنچ گیا۔ قرآنی فکر کے شیدائیوں کی آدھی منزل حسن وخوبی سے تکمیل پاگئی اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس نشاط انگیز مرحلہ پر بارگاہ رب العزت میں سجدۂ شکرانہ کی ادائیگی کے لئے آئندہ اتوار (۲۵ جولائی) کو ایک خصوصی تقریب کا اہتمام کیا جائے۔ درس کے خاتمہ پر احباب کی ایک مجلس مشاورت منعقد ہوئی اور مختصر سے وقفے میں تقریب منانے سے متعلق تمام تفصیلات طے پاگئیں۔

لاہور کے تاریخی شہر کے دامن میں پھیلی ہوئی نئی نویلی گلبرگ کالونی اپنی شادابیوں اور دلکشائیوں کے اعتبار سے پورے برصغیر میں اپنی مثال آپ ہے۔ خوبصورت بنگلوں کی قطاروں کے پہلو میں حسن ترتیب سے پھیلی سڑکوں اور سبزہ زاروں نے اس حسین وجمیل بستی کو ایک "جنتِ ارضی" کی صورت عطا کر رکھی ہے۔ گلبرگ کالونی کی انہی شاداب فضاؤں میں مفکر قرآن جناب پرویز کا وہ مسکن واقع ہے جسے عصر حاضر کی علمی بارگاہوں میں مرکز فکر قرآنی کا اعزاز حاصل ہے۔ جہاں قرآن کا یہ عظیم طالب علم اپنے مخصوص کمرے کی خاموش خاموش سی علم افروز خلوتوں میں کھویا ہوا تاریخ انسانی کے اس انقلاب عظیم کی ممکنات کے لئے وقف ہے جو اس کی پیش کردہ دعوت قرآنی کے صدقے

میں ایک دن یقیناً اسی طرح ابھر کر سامنے آئیگا جس طرح شب تار کی پہنائیوں سے صبح بہار کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

مرکز درسِ قرآنی

یہی وہ مسکن ہے جہاں پرویز صاحب ۱۹۵۸ء میں کراچی سے منتقل ہوئے۔ اور ان کی یہاں تشریف فرمائی کے بعد درس قرآن کا آغاز ہوگیا۔ اس مدت میں ہر اتوار کی صبح کو یہ مجلس پوری باقاعدگی اور نظم و ضبط سے آراستہ ہوتی رہی۔ دن مہینوں اور سالوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ گردش شام و سحر کا سلسلہ جاری رہا۔ موسمی انقلابات میں شدائد اور دلکشائیوں کی مختلف صورتیں ابھرتی رہیں۔ تند و تیز آندھیاں پورے جوش و خروش سے حملہ آور ہوتی رہیں، کتنے ہی فتنے شب و روز گھات میں رہے لیکن قرآن کا نقیب دعوت قرآنی کی شمع نورانی ہاتھوں میں سے لئے پورے حسن ضبط اور مومنانہ عزم کی مخصوص مسکراہٹیں لبوں پر لئے اپنی منزل مراد کی جانب بڑھتا رہا۔ قرآنی فکر و بصیرت کی شمع نورانی برابر ضوفشاں رہی۔ پروانے برابر اس کے گرد منڈلاتے رہے "تا آنکہ وہ مبارک دن آگیا جب یہ پروانے رب ذوالمنن کے آستانہ عظمت پر سربسجود ہونے کے لئے اس مرکز فکر قرآنی میں جمع ہوگئے۔

باران رحمت کی فیض بخشیوں میں دھلی ہوئی ۲۵ جولائی کی صبح مسکراتی ہوئی نمودار ہوئی۔ ۲۵/بی گلبرگ (مفکر قرآن کا مسکن) اپنے دامن میں کچھ تازہ بتازہ رونقیں اور روح نوازیاں سمیٹے ہوئے تھا۔ قرآنی انقلاب کے طائران پیش رس طلوع سحر کے ساتھ ہی ضروری تیاریوں اور انتظامات میں کھو گئے تھے۔ اور آٹھ بجے سے قبل ہی اس مبارک تقریب کے لئے پنڈال آراستہ ہوچکا تھا۔ سینکڑوں نشستیں مخصوص حسن ترتیب لئے ہوئے تھیں۔ جلسہ گاہ کا مختصر سا پر وقار پلیٹ فارم الگ نگاہوں کا مرکز بن رہا تھا۔ سرسبز و شاداب گلدستے الگ بہار دکھا رہے تھے۔ رات کی باران رحمت کی بچی کھچی یادگار چھوٹی چھوٹی بدلیاں فضا میں تیر رہی تھیں۔ اور مرکز قرآنی کی فضا وجد و مسرت سے جھوم رہی تھی۔

آغاز تقریب اور استقبالیہ

پروگرام کے مطابق نو بجے اس تقریب کا آغاز ہو رہا تھا لیکن احباب تھے کہ آٹھ بجے ہی پہنچنے شروع ہوگئے تھے اور نو بجے تک تمام نشستیں پر ہوگئی تھیں۔ تقریب کا باضابطہ آغاز ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی صدارت میں ہوا۔ محترمہ بہن ثریا عندلیب نے تلاوت کلام پاک سے اجلاس کا افتتاح کیا اور اس کے بعد مرزا محمد خلیل صاحب نے کلام اقبالؒ سے قلب و نگاہ کو نئی حرارت عطا کی۔ محترم خلیل صاحب کے بعد شیخ سراج الحق صاحب (جو پرویز صاحب کے قدیم ترین دوست، اور قرآنی فکر کے السابقون الاولون میں سے ہیں)، استقبالیہ

خطاب لے کر آئے۔ انہوں نے شرکائے مجلس کا خیر مقدم کیا اور اس تقریب کو ایام رفتہ کا حاصل زیست اور مستقبل کی امیدوں کا سہارا قرار دیا۔ اور واضح کیا کہ کس طرح سات سال قبل محترم پرویز صاحب لاہور میں منتقل ہوئے اور ان کی پاکیزہ آرزوؤں کو اس کی بدولت شرف ایجاب نصیب ہوا۔ جولائی ۱۹۵۵ء میں اس مبارک مجلس کی ابتداء دین کے بنیادی تصورات کی مسلسل وضاحت سے ہوئی اور ستمبر ۱۹۶۱ء میں قرآن کریم کے درس کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ محترم شیخ صاحب نے جب اس سلسلے میں وقفے کے ان صبر آزما ایام کا ذکر کیا جب پچھلے سال، مفکر قرآن ایک اپریشن کے دوران زندگی اور موت کی کشمکش میں گھر گئے تو ان کی آواز شدت احساس سے بھرا گئی۔ انہوں نے اس کشمکش کے سلسلہ میں محترم ڈاکٹر عبدالودود صاحب کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا جب یہ کہا کہ "ہم نے اس سے پہلے عشق و مستی کی داستانیں ضرور سنی تھیں لیکن اس زمانے میں ہم نے ان داستانوں کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھا" تو احباب پر تاثر کا ایک وجد آمیز سماں طاری ہو گیا اور بہت سی پلکوں پر ایام رفتہ کی اس یاد سے گہرائے آبدار ڈھلک آئے، شیخ صاحب نے اپنا استقبالیہ پرویز صاحب کے حق میں اس دعا سے ختم کیا کہ

آتی ہیں جو تیرے آستاں کو
آباد رہیں وہ راہ گذاریں

سلسلۂ تاثرات کے اظہار کا آغاز

محترم شیخ صاحب کے اس استقبالیہ کے بعد پرویز صاحب کے درس قرآن کریم سے متعلق سامعین کے تاثرات کا سلسلۂ اظہار شروع ہوا۔ سب سے پہلے ناظم ادارہ طلوع اسلام (راقم الحروف) نے اپنے تاثرات پیش کئے اور پھر بتایا کہ (TAPES) کی وساطت سے قرآن کی یہ آواز کس نظم و ضبط کے ساتھ پاکستان اور بیرون پاکستان کے مرکزوں میں پہنچ رہی ہے۔ کس طرح آئندہ نسلوں کے لئے یہ آواز (MASTER TAPES) میں محفوظ کی جا رہی ہے اور اس طرح مفکر قرآن کے اپنے الفاظ میں یہ متاع بے بہا آنے والے دور کے کام آسکے گی۔

محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ

اب سلیم بھائیوں کی قابل فخر طاہرہ بہن ثریا عندلیب اپنے تاثرات ایک مفصل مقالہ کی صورت میں لئے مائیک پر آئیں۔ پرویز صاحب اور ان کے درس قرآن سے متعلق پر خلوص

جذبات واحساسات کی اُجلی اُجلی اور نکھری نکھری داستان، زندگی، مذہب کی کن بھول بھلیوں میں بھٹکتی پھری۔ قلب و نگاہ حقیقت دین مبین کی تڑپ و خلش میں، دقت تجسس اور تشنہ کام ہے اور پھر میدائے فیض کی گرم گستری سے حرماں نصیب زندگی کو وہ روشنی مل گئی جس نے منزل مراد کو نگاہوں کے سامنے لاکر رکھ دیا اور یہ سب کچھ مفکر قرآن کی بصیرت قرآنی کا صدقہ تھا۔ اس کے درس قرآنی کے فیوض و برکات کا صلہ تھا۔ ثریا عندلیب اپنے مخصوص انداز بیان میں یہ سلسلۂ تاثرات پیش کرتی گئیں اور مفکر قرآن کی فیض بخشیوں کے نقوش قلوب و اذہان کے پس منظر سے ابھرتے چلے گئے۔ پھر انہوں نے دلوں کے دروازوں پر دستک دیتے ہوئے اپنے سلیم بھائیوں اور طاہرہ بہنوں کو یاد دلایا کہ یہ دعوت انقلاب اسلئے نہیں کہ جذبات و احساسات کی پہنائیوں میں سمو کر رہ جائے بلکہ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے زندگی کے محسوس و مشہود پیکروں میں عملاً متشکل کر کے قرآن کی ابدی صداقتوں کی شہادت بہم پہنچائی جائے۔

عزیز قریشی صاحب

محترمہ ثریا عندلیب رخصت ہوئیں تو بزم راولپنڈی کے نمائندہ محترم عزیز قریشی صاحب کی باری آئی۔ قریشی صاحب نے سب سے پہلے اپنی زندگی کے اس دور سے نقاب اٹھایا جب وہ مسلک خانقاہیت کا تقدس لئے ہوئے دعاؤں، وظیفوں، تعویذوں اور ٹوٹکوں کی خوش فہمیوں اور مناظرے بازی کی خود فریبیوں کو خدمت دین سمجھے ہوئے تھے اور پھر طلوع اسلام کی دعوت قرآنی نے آہستہ آہستہ ان کی خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کی بساط کو الٹنا شروع کیا پھر قرآن کی بادِ بہار آئی اور قلب و نگاہ کے چمن زار میں فکر و بصیرت کی کونپلیں پھوٹنے لگیں اور زندگی کو نور و نکہت کا وہ بیش بہا سرمایہ مل گیا جو قرآن کے باب عالی کے سوا اور کسی بارگاہ سے نہیں مل سکتا۔

بیگم رشیدہ صلاح الدین صاحبہ

قریشی صاحب کے بعد محترمہ بیگم رشیدہ صلاح الدین کی مائیک پر آمد کا اعلان کیا گیا۔ قرآن کے شیدائی محترم عبدالعزیز مرحوم کی نورِ چشم اور درد انسانیت کے چارہ ساز ڈاکٹر صلاح الدین اکبر کی زوجہ محترمہ بیگم رشیدہ فرطِ حیا کے قطرے پیشانی پر لئے اپنے بھائیوں اور بہنوں کے سامنے آئیں۔ ان کا مقالہ بڑا ہی مختصر سا تھا لیکن وہ اس اختصار کے ساتھ ہی بہت کچھ کہہ گئیں۔ یعنی

پرویز صاحب کے درس قرآن سے پہلے کی وہ کیفیت جب کسی ترجمے اور تفسیر سے اطمینان کی بجائے ذہنی کشمکش میں پیش از پیش اضافہ ہوتا رہتا تھا اور پھر پرویز صاحب کے درس قرآن نے قلب و نگاہ کے زاویے اس طرح بدل دیئے کہ زندگی اور قانون مکانات کا ہر گوشہ نکھر نکھر کر نگاہوں کے سامنے آتا گیا۔

ظفر عباس قریشی صاحب

اب محترم ظفر عباس قریشی سامنے آئے۔ بزم طلوع اسلام جھنگ صدر کے سابق نمائندہ اور ادارہ طلوع اسلام کے رکن ظفر عباس۔ ان کا مقالہ دو زمانوں کے مختلف اور متضاد تاثرات کا تقابل لئے ہوئے تھا۔ یعنی پہلا تو ہمات کا دور جب مذہب کے نام پر ہر روش تقلید کے تحت سرانجام پاتی تھی اور فکر و بصیرت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور پھر نوش نصیبیوں کا وہ دوسرا دور جب پرویز صاحب کی دعوت فکر نے قرآن کریم کا سراج منیر سر راہ لاکر رکھ دیا اور اس کی روشنی میں خدا کا دین علیٰ وجہ البصیرت نکھر کر سامنے آگیا۔ اسی روشنی نے دین کو سمجھنے اور سمجھ سمجھ کر دستور زندگی کے طور پر قبول کرنے کا رجحان اور ذوق و شوق عطا کیا۔

میجر یوسف ڈار صاحب

محترم ظفر عباس کے بعد میجر یوسف ڈار صاحب نے مائیک سنبھالا۔ سرخ و سفید میجر ڈار جن کا فکر قرآنی کا جذب و تعشق اور خلوص و فا ان کے چہرے سے جھلکتا نظر آتا ہے اور جن کی گرمجوشیوں کی بدولت لاہور چھاؤنی کی فضاؤں میں دعوت قرآنی کے چرچے فردوس گوش بنے رہتے ہیں، چہرے پر باوقار مسکراہٹیں لئے احباب کے سامنے آئے اور تحریری مقالہ کی بجائے فی البدیہہ اپنے تاثرات کے چند اہم گوشے منظر عام پر لائے۔ اپنی خوش نصیبیوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ جب ان کا تبادلہ کراچی میں ہوا تو انہیں فاؤلر لائن کا وہی مکان قیام کے لئے نصیب ہوا جہاں پہلے مظہر قرآن فروکش تھے۔ وہی مکان جہاں بڑ کے درخت کے نیچے ان کے درس قرآنی کا سب سے پہلے آغاز ہوا تھا۔ اسی یادگار مکان میں رہتے ہوئے سبحانی صاحب (مرحوم) کے ہاں شریک درس ہونے کی سعادت حاصل ہوئی اور جب پرویز صاحب لاہور منتقل ہو گئے تو ایک ہی شدت آرزو تھی جو لبوں پر دعا بن بن کر ابھرتی رہی اور آخر ایک دن یہ دعا شرف ایجاب

پاگئی اور لاہور میں تبادلہ ہونے کی وجہ سے ہمیں کسب فیض کے وہ مواقع پھر نصیب ہوگئے جو پرویز صاحب کے یہاں درس قرآنی کی بدولت حاصل ہیں۔ میجر ڈار نے واضح کیا کہ یہ درس ایک تحریک ہے جو بالآخر ایک دن عالمگیر نظام ربوبیت کے قیام پر منتج ہوگی۔ اس منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم اس پیغام کو پوری جرأت کے ساتھ دوسروں کے سامنے پیش کریں۔

میجر ڈار صاحب کی تقریر کے بعد مجلس کو مختصر وقفہ کے لئے برخاست کر دیا گیا۔ اب مطلع بادلوں سے صاف ہو چکا تھا۔ دھوپ خاصی تیز ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود مجمع کے جذب و کیف میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

چوہدری محمد اشرف صاحب

پونے بارہ بجے یہ مجلس از سر نو پھر آراستہ ہوئی اور بزم لاہور چھاؤنی کے نمائندہ چوہدری محمد اشرف کے مقالہ سے کارروائی کا آغاز ہوا۔ اپنے خوشگوار تاثرات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے چوہدری صاحب نے بتایا کہ بچپن سے کہانیاں سنتے چلے آئے تھے۔ کچھ بڑے ہوئے تو قرآن کی کہانیاں سنائی جانے لگیں۔ اور دل میں یہ تاثر قائم ہو گیا کہ قرآن کریم صرف اقوام سابقہ کی کہانیاں سنانے آیا ہے۔ اسی دوران میں ایک مبارک صبح چچا جان کے ساتھ پرویز صاحب کے درس میں شریک ہوا تو تصورات کے کتنے ہی پردے چاک چاک ہو گئے۔ پرویز صاحب کی مطبوعات اور درس کی آئندہ مجلسیں سامنے آئیں تو واضح ہوا کہ قرآن کریم تو ہمارے اپنے ہی ذکر پر مشتمل ہے۔ یہ تو ہماری اپنی ہی داستانیں ہیں۔ ہمارے ہی مسائل کا حل ہے۔ ہمارے ہی نہیں بلکہ ہر دور کی مشکلات اور مسائل کا نکھرا نکھرا حل۔ یہیں سے قرآن کی حقیقی عظمت ابھر کر سامنے آئی اور یہ سب کچھ پرویز صاحب کے درس قرآنی کی حقیقت کشائیوں کا صدقہ ہے۔

محترمہ خضر عارفی صاحبہ

عزیزہ بہن بیگم خضر عارفی کا نام اس مجلس کے لئے کسی قدر نیا سا تھا۔ قوم کی یہ ہونہار طاہرہ بیٹی اردو اور فلسفہ میں ڈبل ایم۔ اے کر چکی ہیں اور ان دنوں ڈاکٹریٹ کی تیاری کی فکر میں ہیں۔ وہ پچھلے چند ہی ماہ سے پرویز صاحب کے درس میں شریک ہوئی ہیں اور اس تھوڑی

سی مدت میں انہوں نے قرآن کی بارگاہ عظیم سے جو روشنی پائی اس کی کرنیں ان کے فی البدیہہ خطاب سے پھوٹ پھوٹ کر فضا میں جلوہ بار ہو رہی تھیں۔ محترمہ خضر عارفی نے اپنے تاثرات سے نقاب اٹھتے ہوئے نپے تلے الفاظ میں واضح کیا کہ میں مشرق سے پوری طرح مایوس تھی اور میرا ذوق تجسس ہمیشہ بارگاہ مغرب کا رُخ کرتا تھا لیکن پرویز صاحب کے درس قرآن نے جلد ہی میری غلط فہمیاں ختم کر دیں۔ میرے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ مشرق کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کوئی ایسا شخص بھی اٹھے گا جو قرآن کی شمع نورانی سے فضا میں وہ روشنی پھیلا دے گا جو مسائل زندگی کو اس طرح حل کر کے رکھ دے گی کہ مغرب کو بھی اس پر رشک آئے۔ محترمہ خضر عارفی نے کہا کہ کل تک وہ محسوس کرتی تھیں کہ وہ موت کی فضا میں بہہ دان چڑھ رہی ہیں۔ ہماری قوم کا زندہ قوموں کے دوش بدوش چلنا ناممکن دکھائی دیتا تھا اور زندگی ایک تہمت سی نظر آتی تھی۔ لیکن قرآن کریم کی روشنی نے اب ان مایوسیوں کو امیدوں میں بدل دیا ہے، پرویز صاحب زندگی کی روشنی لے کر آئے اور انہوں نے یہ حقیقت واضح کی کہ خدا کا دین ذہنوں کو کام میں لانے کا اذن عام دیتا ہے۔ وہ عقل و فکر کے سرچشموں پر پابندیاں عائد نہیں کرتا اور اگر آپ فکر و بصیرت کے چراغ روشن رکھیں تو زندگی کی راہیں روشن ہو کر سامنے آتی جائیں۔

محترمہ خضر عارفی نے اپنے تاثرات کا ایک اور گوشہ منظر عام پر لاتے ہوئے کہا کہ اس سے پہلے وہ جنت اور دوزخ کو کہیں بہت دور آسمانوں پر سمجھا کرتی تھیں لیکن اب یہ حقیقت سامنے آئی کہ زندگی کو سنوارنے سے جنت پیدا ہوتی ہے اور اس کی تخریب جہنم کو جنم دیتی ہے۔ میرے نزدیک پرویز صاحب کی حیثیت ایک داعیٔ انقلاب اور پیغام آور کی ہے۔ وہ ہماری قوم کے لئے روشنی کا ایک مینار ہیں اور ایک قندیل راہ بھی۔ محترمہ خضر عارفی کا خطاب بڑا بصیرت افروز اور اثر آفرین تھا۔ اور اس نے حاضرین پر وجد کی سی کیفیت طاری کر دی۔

راجہ محمد اکرم ایڈووکیٹ

راجہ محمد اکرم صاحب حلقہ طلوع اسلام کے جانے پہچانے سرگرم احباب میں سے ہیں اور لاہور کے ایک ہونہار اور جواں بخت ایڈووکیٹ ہیں۔ انہوں نے اپنے تاثرات بڑے مختصر سے وقت میں قلمبند کئے تھے اور جب انہوں نے اپنے اس مقالے کا آغاز کیا تو ان کے انداز بیان کی شگفتگی اور خلوص حاضرین کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھا۔ محترم راجہ صاحب نے پہلے یہ

واضح کیا کہ مذہب کے نام پر مروجہ تصورات نے انہیں کس کشمکش اور بالآخر کس مایوسی اور بدگمانی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ کس طرح کراچی میں انہیں پرویز صاحب کا درس قرآن سننے کا موقع ملا اور پہلے ہی درس میں انہیں وہ کچھ مل گیا جس کے لئے فکر و بصیرت کی تشنہ کامیاں مدت سے آرزو تھیں۔ اور جوں جوں وہ مفکر قرآن کے قریب تر ہوتے گئے دل و دماغ سے تمام گرد و غبار اٹھ گیا اور قرآن کی زبان سے یہ حقیقت واضح ہوتی گئی کہ خدا کی کتاب مسائل زندگی کو کس حسن انداز سے حل کرتی ہے۔ کسقدر نورانی اور رنگین تھا ان کے مقالہ کا یہ عنوان — پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن۔ یہ اپنے اختصار میں ساری تفاصیل سمٹائے ہوئے تھا۔

محترمہ پروفیسر شمیم انور صاحبہ

اس کے بعد محفل طلوع اسلام کی جانی پہچانی طاہرہ بہن محترمہ پروفیسر شمیم انور اسٹیج پر آئیں۔ محترمہ بہن نے چند ہی سالوں کے عرصہ میں لاہور کی علمی فضاؤں میں جس زلزلہ انگیز انداز سے قرآنی انقلاب کا پیغام عام کر کے ایک تہلکہ سا پیدا کر دیا ہے اس سے سرزمین لاہور کا ذرہ ذرہ واقف ہے انہوں نے اپنے حرارت آفریں مقالہ میں (جو نہایت بلند آہنگ انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا) پہلے بتایا کہ مذہب نے عورت کے متعلق جو نفرت انگیز تصورات عام کر رکھے تھے ان کی وجہ سے وہ (ملا کے پیش کردہ) اسلام سے متنفر اور باغی ہو چکی تھیں۔ اور ان کے دل میں جو شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ان کی کسقدر خوش بختی تھی کہ اتنے میں پرویز صاحب لاہور آ گئے اور لاہور میں بھی ان کا مسکن ان کے مکان سے کتنا قریب قرار پایا۔ یہ ان کی زندگی کی انقلاب آفریں ساعت تھی جس کے بعد وہ علیٰ وجہ البصیرت دل و دماغ کے پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ دین کی صداقتوں کی قائل ہی نہیں گرویدہ ہوتی چلی گئیں۔ قرآن کریم کے ان درسوں نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ اس لئے ان کے نزدیک یہ درس نہیں، ہر متجسس قلب کے لئے حیات نو کے پیغام بر ہیں۔ جب انہوں نے کہا کہ کس قدر اطمینان بخش ہے یہ یقین کہ کم از کم اس دنیا میں ایک انسان تو ایسا ہے جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے تو صدائے تحسین سے فضا مرتعش ہو گئی۔ اس مقالہ نے دلوں کی دنیا میں ایک تحرک پیدا کر دیا۔

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کا صدارتی خطاب

سلسلۂ تاثرات کی آخری کڑی صدرِ مجلس ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کا صدارتی خطاب تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس تقریب کے محرک تھے اور انہیں پورے حلقۂ احباب میں یہ امتیازی شرف حاصل ہے کہ وہ گذشتہ سات برس سے ہر درس کے اہم نکات کو ضبطِ تحریر میں لاتے رہے ہیں۔ اور اس فکرِ قرآنی کے ایک ایک گوشے کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھنے کیلئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔ انکا خطاب بیحد جامع تھا۔ نظر آتا تھا کہ اس کی تیاری میں کسقدر محنت اور کاوشِ فکر سے کام لیا گیا ہے۔ اور اس کی بدولت پرویز صاحب کی پیش کردہ فکرِ قرآنی کا ایک ایک گوشہ نکھر کر حاضرین کے سامنے آتا چلا گیا اور قرآن کی عطا فرمودہ مستقل اقدارِ حیات کی رُو سے انسانی زندگی میں جس قسم کا حیات آفریں نقشہ ترتیب پاتا ہے اس کے خدوخال نمایاں طور پر واضح ہوتے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا مقالہ درحقیقت پرویز صاحب کے پہلے دو سال کے درسوں کا ملخص تھا جن میں انہوں نے قرآن کریم کے پیش کردہ بنیادی تصورات کی وضاحت فرمائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان تصورات کو اس حسنِ اختصار کے ساتھ یکجا کر کے فی الحقیقت قرآن کریم سے شغف رکھنے والوں پر بڑا احسان کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اظہارِ تاثرات کا آغاز کرتے ہوئے بتایا کہ قرآن کریم کے مقاصدِ اعلیٰ پر ہر دور میں نئے نئے پردے ڈالے گئے اور ایسے بندگانِ خدا اور اربابِ بصیرت بھی ہر دور میں سامنے آتے رہتے جنہوں نے ان پردوں کو چاک کرنے کے لئے پوری سعی دکاوش سے کام لیا۔ تعلیماتِ قرآنی کے ان عظیم القدر داعیوں میں پرویز صاحب کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ انہوں نے منظم طور پر اپنی آواز بلند کی۔ قرآن کی صداقتوں پر پڑے ہوئے دبیز پردوں کو ایک ایک کر کے اٹھا اور پوری وضاحت سے ایک ایک کر کے اس کے اصول و اقدار کو منظرِ عام پر لائے۔

اپنے صدارتی خطاب کا اختتام کرتے ہوئے انہوں نے بارگاہِ رب العزت میں پرویز صاحب کی صحت اور زندگی کے لئے دعا کی۔ یہ دعا کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی آواز بھرا گئی اور شدتِ آرزو کی لرزشوں سے پوری مجلس پر تاثر کا ایک سماں طاری ہو گیا۔ حاضرین کے دل و دماغ اس پر خلوص دعا میں ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دے رہے تھے اور ساتھ ساتھ سب لبوں پر بے ساختہ "آمین" کی ہلکی ہلکی پرسوز صدائیں ابھر رہی تھیں۔

نذرِ تحسین تحفوں کی صورت میں

اس موقع پر مختلف تحفوں کی صورت میں نذرِ تحسین کی پیشکش کا سماں سامنے آگیا مختلف بزمیں اور احباب اس والہانہ آرزو کو لے کر حاضر ہوئے تھے کہ جس محسن جلیل نے ان کی زندگی کی تاریک راہوں کو قرآن کی روشنی سے مالا مال کیا اُسے کسی نہ کسی انداز سے نذرِ تحسین کی پیشکش کا شرف حاصل کریں۔ محترم پرویز صاحب نے اپنے دورِ شباب سے پوری زندگی قرآن کی روشنی کو روئے زمین کے آخری گوشے تک پہنچانے کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اس مبارک زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی مقصود و منتہیٰ کی نذر ہو چکا ہے۔ اس کے لئے وہ نہ کسی سے ستائش کی تمنا رکھتے ہیں نہ صلہ کی امید۔ وہ اسے اپنی زندگی کا مشن سمجھتے ہیں اور اس جذبہ کے ماتحت اس میں ہمہ تن جذب رہتے ہیں اسی استغنا نے ان کے اندر ایک قلندرانہ شان بے نیازی پیدا کر رکھی جس کے پیشِ نظر احباب کو یہ اندیشہ لاحق تھا کہ ان کی سوت کی انٹی کی یہ پیشکش کہیں مسترد ہو کر نہ رہ جائے۔ جو احباب نذر تک نثار کرنے کی امنگیں رکھتے ہیں ان کی اس نذرِ تحسین کا ٹھکرایا جانا دلوں کے نازک آبگینے توڑ کر رکھ دیتا۔ پرویز صاحب کو اس کے لئے بہت کچھ سوچنا پڑا۔ وہ کسی مخلص انسان کا دل توڑنا سیکھے ہی نہیں انہوں نے ان چہروں کا جائزہ لیا جو زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ ہماری نذرِ تحسین کی نوعیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ یہ درباری شاہی میں درباریوں کی کوئی بیش قیمت پیشکش نہیں۔ قرآن کے شیدائیوں کی منفکر قرآن کی بارگاہ میں نذرِ تحسین ہے۔ اور یہ قلم یہ ٹیپ (ریکارڈر) یہ قرآن کریم کا حسین نسخہ۔ کچھ اور چیزیں جو ابھی خریدی نہیں گئی تھیں یہ سب درحقیقت مظاہر ہیں۔ ہمارے اخلاص و محبت کے اسلئے انہیں ٹھکرانے کی کوئی وجہ جواز بھی تو نہیں۔ تحائف کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں کی ہر چیز قرآنی نگارگاہ کے استعمال کی تھی۔ پرویز صاحب کے ذاتی استعمال کی نہ تھی۔

پرویز صاحب نے یہ سب کچھ سوچا۔ جھکی ہوئی اشکبار نگاہوں کے ساتھ لرزتے کانپتے ان کے قدم آہستہ آہستہ پلیٹ فارم کی طرف بڑھے۔ احباب کے چہروں پر مسکراہٹیں رقص کرنے لگیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے اس مقام پر ایک بڑے ہی حسین جذبہ اور نزاکت احساس سے کام لیا۔ احباب نے یہ نذرِ محبت پیش کرنے کے لئے انہیں منتخب کیا تھا۔ ان کی نگاہ ایک اور گوشے کی طرف اٹھی۔ بزمِ درسِ قرآن کریم میں محترمہ بیگم انور (والدۂ شمیم انور) ایک بزرگ خاندان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور خود پرویز صاحب ان کا احترام بڑی بہن کی طرح کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب

نے یہ تصانیف ان کی طرف بڑھا دیئے کہ انہیں پیش کرنے کے لئے اُن سے زیادہ موزوں شخصیت کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ پیش و قبول کا یہ سماں بڑا ہی انبساط آمیز اور رقت انگیز تھا۔

مفکر قرآن کی صدائے سوز ناک

یہ مبارک تقریب اب اپنے اتمام کو پہنچنا چاہتی تھی۔ قلب و نگاہ کے پر خلوص تاثرات موتیوں کی طرح سلکِ اظہار و بیان میں پروئے جا چکے تھے۔ اور سب کی نگاہیں بے تابانہ اس مردِ راہ دان کی طرف اُٹھ رہی تھیں جس کی بصیرت قرآنی کے صدقے میں جشنِ قرآنی کی یہ مبارک مجلس آراستہ ہوئی تھی۔ پرویز صاحب کا فریضہ انہیں مائیک پر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ وہ مائیک پر آئے لیکن دل میں وفورِ جذبات کے اُبلتے ہوئے طوفان لئے ہوئے

ع آنکھوں میں دردمندی ہونٹوں پہ مسکراہٹ

فیضؔ کا یہ مصرع ان کی اس کیفیت کا پورا پورا ترجمان تھا۔

ان کے خطاب کا آغاز لرزتے ہوئے ہونٹوں اور کانپتے ہوئے الفاظ سے ہوا۔ صدرِ مجلس اور احباب کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

اس تقریب پر آپ نے جس خلوص و محبت اور عزت افزائی سے کام لیا ہے اس کے شکریہ کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ میری جھکی ہوئی اشکبار نگاہوں سے ہدیہ تشکر قبول فرمایئے۔ آپ سے میرا رشتہ قرآن کریم کا رشتہ ہے اور یہ رشتہ کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ شرفِ انسانیت کے تقاضے اسی رشتے کی تلاش میں ہیں۔

میں نے ہمیشہ آپ کے سامنے خالص قرآن پیش کیا ہے اور قرآن کو پیش کرنا بہت بڑی نازک ذمہ داری ہے۔ اس کے لئے جب میں صبح سویرے قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو قلم کانپ جاتا ہے۔ اور ہاتھ لرزنے لگ جاتے ہیں۔ جب درس کے لئے آپ کے سامنے آتا ہوں تو چہرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے اور دل کی گہرائیوں میں لرزشیں بپا ہوتی ہیں۔ جب میں نے پہلے پہل قرآن کریم کو پیش کرنا شروع کیا تو پوری دنیا میں تن تنہا تھا۔ کوئی مونس اور رفیق ساتھ نہیں تھا لیکن آج ساٹھا سال کی جگر کاویاں رنگ لا رہی ہیں۔ اور کتنے ہی احباب، سلیم بیٹوں اور طاہرہ بیٹیوں کی رفاقت نصیب ہو گئی ہے۔

مفکر قرآن قدرے رکے۔ آنسوؤں کو پونچھا آگے بڑھے اور فرمایا۔

جب کوئی شخص لوگوں کے سامنے اس چیز کو پیش کرتا ہے جس پر وہ پہلے سے ہی چلے آرہے ہوں تو سب اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ لیکن جب کوئی صورت حال کا رُخ بدلنے کے لئے اپنی دعوت انقلاب پیش کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے اور کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ اور میرے پاس تو کوئی آیا بھی تو میں نے کہہ دیا ؎

لگائے آگ جو گھر کو ہمارے ساتھ چلے

آخر یہ گھر کو آگ لگا کر ساتھ چلنے والے ایک ایک دو دو کر کے جمع ہوتے گئے اور ان سے ایک نئی دنیا آباد ہوتی گئی۔ خدا ان سب کو عمر خضر عطا فرمائے۔ میرے یہ سلیم بیٹے اور طاہرہ بیٹیاں زندہ و سلامت رہیں۔ آخری عمر میں ہر شخص کو "اولاد" کی ہوس ہوتی ہے۔ میں بھی اس ہوس سے بالاتر نہیں لیکن اب میں اطمینان کی موت مروں گا کہ خدا نے ان سینکڑوں بیٹوں اور بیٹیوں کی صورت میں مجھے سب کچھ عطا کر دیا۔

مجھے امید ہے کہ میرے بعد بھی ان کے ہاتھوں یہ دیا جلتا رہیگا اور اس کی روشنی پھیلتی رہیگی۔

یاد رکھئے کہ میں نے کبھی کوئی بلند آہنگ دعویٰ نہیں کیا۔ میری حیثیت ہمیشہ ایک طالب علم کی رہی ہے اور میری کوئی بات حرف آخر نہیں۔ آپ کے یہ تحفے دراصل عظمت قرآن کریم کے حضور میں خلوص و محبت کی پیشکش ہیں۔ اس لئے یہ میرے لئے زندگی کی شیرینیاں لے کر آتے ہیں۔

محترم پرویز صاحب کے خطاب کے بعد مرزا محمد خلیل صاحب احباب کا شکریہ ادا کرنے کے لئے مائیک پر آئے۔ شکریہ کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی اس سعادت کا بھی ذکر کیا کہ انہیں محترم پرویز صاحب کی رفاقت قریب تیس سال سے مسلسل حاصل ہے اور وہ ان کی فکر سے زیادہ ان کی زندگی سے متاثر ہوئے ہیں جو جلوت اور خلوت میں ایک جیسی ہے اور جس میں کوئی راز ہی نہیں۔ ان کے اظہار تشکر کے ساتھ یہ حسین اور پاکیزہ مجلس اختتام پذیر ہوگئی اور اس کے بعد حسب اعلان شرکائے اجلاس دوپہر کے کھانے میں شریک ہوگئے۔ مقامی احباب کے علاوہ راولپنڈی، مردان، لائل پور، لیہ، پنڈ دادن خاں، رسول نگر اور ننکانہ کی بزم ہائے طلوع اسلام کے نمائندوں اور اراکین نے خصوصی دعوت پر تقریب میں شرکت کی۔

اس محفل کی یاد کبھی فراموش نہ ہو سکے گی۔

استقبالیہ

(شیخ سراج الحق صاحب، سکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی)

محترم ڈاکٹر صاحب۔ عزیز بہنو اور بھائیو — سلام و رحمت۔

انسان کی زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جنھیں بیتے ہوئے دنوں کا حاصل زیست اور آنے والی باقی زندگی کی امیدوں کا سہارا کہا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک آج کی یہ بابرکت تقریب اسی نوعیت کی ہے۔ میں آپ تمام احباب کا جو اس اجتماع کو پُرمسرت بنانے کے لئے تشریف لائے ہیں، اپنے دل کی گہرائیوں سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ تقریب درحقیقت بدرگاہ رب العزت سجدۂ شکرانہ پیش کرنے کے لئے منعقد کی گئی ہے جس کی عطا کردہ توفیق سے ہم نے اُس کی کتاب پاک کے درس و تدریس کی آدھی منزل بحسن و خوبی طے کر لی ہے۔

عزیزان من۔ میرے لئے یہ امر صد ہزار فخر و مسرت کا موجب ہے کہ محترم چوہدری صاحب (میری مراد پرویز صاحب ہیں) کے ساتھ میرے تعلقات عمر بھر کے ہیں جب انہوں نے ۱۹۵۵ء میں قبل از وقت پنشن لے لی تاکہ وہ اپنی عمر عزیز کا بقایا وقت تمام تر قرآنی مشن کے لئے وقف کر سکیں تو — اسے آپ خود غرضی کہئے یا اُن کے مشن سے محبت کا تقاضا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ کراچی سے منتقل ہو کر لاہور آ جائیں۔ چنانچہ میری یہ آرزو بر آئی اور وہ اپریل ۱۹۵۸ء میں لاہور تشریف لے آئے۔ تین ماہ کے بعد جب یہ دارالقرآن یعنی ۲۵/ بی گلبرگ مکمل ہو گیا تو انہوں نے یہاں باقاعدہ درس قرآن کریم شروع کر دیا۔ یہ جولائی ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ دو سال سے کچھ اوپر کے عرصہ تک درس کا موضوع اسلام کے بنیادی تصورات رہے کیونکہ ان کے سمجھے بغیر قرآن کریم کو براہ راست سمجھنا بہت دشوار ہے۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۶۰ء سے باقاعدہ درس قرآن شروع ہوا جس کا سلسلہ خدا کے فضل سے اس وقت تک جاری ہے۔ جب سورۃ فاتحہ سے درس کا آغاز ہونے والا تھا تو میرے

جی میں آیا کہ اس کی ابتدا ایک شایانِ شان تقریب سے کی جائے۔ مگر میری وہ آرزو پوری نہ ہو سکی جس کا مجھے آفسوس رہا۔ اس کے بعد میں انتظار میں تھا کہ قرآن کریم کا درس مکمل ہو جائے تو پھر ایسی تقریب منائی جائے۔ لیکن محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب جو زندگی کے ہر خوشگوار راستے میں ہم سے آگے ہوتے ہیں اس باب میں بھی سبقت لے گئے اور انہوں نے تجویز کیا کہ جب پورا قرآن ختم ہوگا تو ایسی تقریب ضرور منائی جائے گی لیکن اس کی نصف منزل طے ہونے پر بھی بدرگاہِ رب العزت سجدہ شکرانہ کیوں نہ ادا کیا جائے۔ تجویز نہایت خوش آئند اور جذبہ بڑا صادق تھا۔ ہر طرف سے اس پر لبیک کہا گیا۔ چنانچہ سابقہ اتوار کو پندرھواں پارہ ختم ہوا اور آج ہم اس مبارک تقریب کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب کو قرآن پاک سے جس قدر والہانہ عقیدت ہے اس کا مظاہرہ تو اُن کے اس جذب و شوق سے ہوتا ہے جس کے ساتھ وہ درس میں شرکت ہی نہیں کرتے اس کے ایک ایک نکتہ کو محفوظ کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن خود قرآن کریم کو پیش کرنے والے کی ذات سے اُنہیں جس قدر محبت ہے اس کا اندازہ ہمیں سال گذشتہ اس زمانے میں ہوا جب چوہدری صاحب قبلہ ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج تھے۔ اس سے پہلے ہم نے عشق کی داستانیں سُنی تو تھیں مگر اُس زمانے ہم نے ان داستانوں کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھا۔ اور یہ اُسی عشق و محبت کا صدقہ ہے کہ ہم اس درس سے برابر مستفید ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میں شکر گذار ہوں — اور مجھے یقین ہے کہ اس باب میں بھی میں آپ تمام حضرات کی ترجمانی کر رہا ہوں — بزم طلوع اسلام لاہور کا اور اُس کے نمائندہ محترم مرزا محمد خلیل صاحب کا جن کی مساعی جمیلہ سے درس کے انتظامات بایں حُسن و خوبی سرانجام پا رہے ہیں اور اس تقریب کے انعقاد میں بھی ان کا نمایاں حصہ ہے۔ نیز میں شکر گزار ہوں آپ تمام احباب کا جنھوں نے اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لئے اس جذب و شوق سے لبیک کہا۔

درس کے انتظام کے سلسلہ میں بزم طلوع اسلام لاہور کا ذکر آیا تو بعید از سپاس گذاری ہوگا اگر اس ضمن میں کراچی کے خصوصی احباب کی خدمات کا ذکر نہ کروں۔ جب کراچی میں درس کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کی ابتدا چوہدری صاحب قبلہ کے صحن میں ایک پیڑ کے نیچے دو تین چارپائیوں سے ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ جب سامعین کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا تو شامیانوں اور کرسیوں کی ضرورت پڑی۔ درس میں شریک ہونے والے احباب میں محترم

ملک محمد سعید صاحب درس کے انتظامات میں بڑی گہری دلچسپی لیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں تگ و تاز کی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ تمام شامیانے جو اس وقت ہمارے سر پر سایہ فگن ہیں اور قریباً ڈیڑھ سو کرسیاں فراہم ہوگئیں جو چوہدری صاحب قبلہ کے لاہور منتقل ہونے پر ساتھ آئیں۔ اس سلسلہ میں کراچی کے ڈاکٹر سعید صاحب مرحوم جنھوں نے اس درس کی پہلی اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھی تھی اور حاجی شیخ محمد دین صاحب۔ (اللہ تعالےٰ ان کی عمر دراز کرے) نے جس فراخ حوصلگی سے کراچی کے درس کو کامیاب بنانے میں امداد کی وہ بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ حاجی صاحب موصوف کا قرآن سے شغف عشق کے درجہ تک پہنچا ہوا ہے۔ اُن کی ذات سے قرآنی مشن کو بہت تقویت حاصل ہوئی ہے۔ اللہ تعالےٰ انہیں جزائے خیر دے۔ باقی رہے چوہدری صاحب قبلہ۔ سو اُن سے میں اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کا حوصلہ ہی نہیں پاتا کہ:۔

جان تم پر نثار کرتا ہوں ۔ میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

اور اگر دعا کرنا ہی پڑے تو اس سے بہتر اور کیا دعا کی جا سکتی ہے کہ:۔

آتی ہیں جو تیرے آستاں کو ۔ آباد رہیں وہ راہ گزاریں

(والسلام)

انسان نے کیا سوچا

انسانی فکر کی دو ہزار سال کی تاریخ ——— جسے نہایت دلچسپ انداز سے بیان کیا گیا ہے اور جس سے انسان شعوری طور پر عقل اور وحی کے صحیح مقامات سے شناسا ہو جاتا ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں اس قسم کی کتاب نہیں ملے گی۔

بڑی تقطیع ۔ ضخامت پونے پانچ سو صفحات

قیمت : بارہ روپے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

ادارہ ۔ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ ۔ بی گلبرگ لاہور

تاثرات

نویدِ حیات

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ

(محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ)

عزیز بہنو اور بھائیو!

خداوند کریم کی یہ رحمت بے پایاں ہمارے لئے باعث صد تشکر و امتنان ہے کہ آج اس اجتماع کے شریک ہم سب بہن بھائیوں کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ ہم اپنے مشفق و مخلص معلم اور دردمند و مومن مرد راہ داں جناب پرویز صاحب کی خدمت میں اپنے ان جذبات و تاثرات قلبی کو پیش کریں جو پچھلے پانچ سال سے ہمارے احساسات کا جزو بنتے چلے آرہے ہیں اور اس کی وجہ آپ میں سے کون نہیں جانتا! ظاہر ہے کہ آج کی تقریب سعید ہم اس سچی خوشی میں منا رہے ہیں کہ ہمیں اس مدت میں پرویز صاحب کی فکر قرآنی اور بصیرت فرقانی کے توسط سے خدا کی آخری و مکمل کتاب قرآن حکیم کے پندرہ پاروں کا ایسا نکھرا اور ابھرا ہوا مفہوم حاصل ہوا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ خدا تعالےٰ کے عطا کردہ انسانوں کے لئے اس واحد ضابطۂ حیات کے حقائق ازلی و ابدی کی وضاحت جس جامعیت اور تابندگی کے ساتھ پرویز صاحب کی زبانی ہمیں ارزانی ہوئی حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک کے بیسیوں علیحدہ علیحدہ تراجم میں سے کوئی ایک بھی اس کی مثال لانے سے قاصر ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اور اس موقع پر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ زمانہ حاضرہ میں خدا کی کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے

کے تعلق سے صدیوں کے بعد ہمارے اس چمن کو یہ دیدہ ور نصیب ہوا جسے پرویز کہتے ہیں۔ قرآن عزیز کے تعلق سے مجھے پرویز صاحب سے جو تعلق پیدا ہوا اور ان کی رہنمائی اپنی زندگی کے لئے جس طرح سنگ میل بنی میرے خیال میں یہاں اس پاکیزہ مجلس میں اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اپنے لڑکپن کا زمانہ یاد آتا ہے گھر کی مذہبی فضا اور بزرگوں کی سلامت روی کے زیر اثر اپنے دل کو بھی مذہب اسلام سے بڑی وابستگی تھی مگر شاید اس وقت دل، دماغ کو اپنی ہمرہی میں لئے ہوئے نہ تھا۔ اور واضح رہے کہ میں نے یہاں مذہب اسلام کا ذکر کیا ہے دین اسلام کا نہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں عام طور پر مذہب کا ہی چرچا ہوتا تھا دین کا نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ دین کو بھی مذہب ہی سمجھا جاتا تھا۔ تو اس مروجہ مذہب کے طفیل مذہبی کتابیں پڑھنے کا بچپن سے ہی شوق اور قرآن پاک کے الفاظ کو پڑھتے رہنے کی عادت پڑ چکی تھی، گھر کی تربیت اور مذہبی کتابوں کی بدولت اخلاق و اطوار کی درستگی اور پند و نصائح کی باتیں بھی سیکھ لیں۔ قرآن کے متعلق یہ عقیدہ عام تھا ہی کہ جتنی دفعہ بار بار قرآن پڑھیں گے اس سے دوگنا چوگنا ثواب ذات باری کی طرف سے مرحمت ہوگا۔ ماہ رمضان میں جتنے زیادہ قرآن ختم کریں گے اتنے ہی اللہ کے محبوب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس جذبے کے تحت قرآن کو اندھوں کی طرح سینے سے لگائے رکھا اور بیسیوں دفعہ نہیں سینکڑوں دفعہ قرآن ختم کر ڈالا۔ یعنی لڑکپن کے زمانے تک ہی اپنی دانست میں یہ معرکہ سر کر لیا۔ اب بھلا ہمارے مسلمان اور سچے و پکے مسلمان ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا تھا۔ اور کیا چاہیئے تھا ہمیں: یہاں تو چھ سات سال کی عمر سے ہی بڑی خوش الحانی سے فر فر قرآن پڑھنا آتا تھا۔ کچھ شعور آنے پر بزرگوں نے قرآن کا ترجمہ پڑھنے کی ہدایت کی۔ چلئے۔ ترجمہ پڑھنے لگے۔ اب ترجموں کی حالت یہ تھی کہ آدھی بات سمجھ میں آتی تو اگلی آدھی کا اس سے کچھ ربط ہی دکھائی نہ دیتا اس صورت میں قرآن کے الفاظ کے معانی جس طرح پہلے پڑھ سکتے تھے ویسے ہی پڑھے بلکہ الرجال قوامون علی النساء۔ توکل علی اللہ۔ ما ملکت ایمانکم۔ ان کید کن عظیم وغیرہم جیسی اہم آیات بینات کے مروجہ ترجموں اور تشریحوں نے دماغ کو ایسا الجھایا کہ خالی قرآن کے الفاظ دہرا لینے میں ہی اپنی عافیت نظر آتی۔ لڑکپن کی ان گھڑیوں میں ہوتے ہواتے سن اڑتیس ۳۸ آپہنچا۔ یہ وہ مبارک سال تھا جبکہ مجھے پرویز صاحب کی ذات گرامی کا علم ہوا اور اس کا ذریعہ طلوع اسلام کا پہلا پرچہ بنا۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ طلوع اسلام کی پہلی نگارشات نے اپنے دل و دماغ پر کیا تاثرات چھوڑے کیونکہ اس وقت کو ستائیس سال کا طویل و عریض عرصہ گزر چکا ہے لیکن میں یہ نہیں بھول سکتی کہ اگر اس وقت طلوع اسلام کے ذریعے پرویز صاحب کی تحریریں میرے لئے

نشان راہ بننے کا آغاز نہ کرتیں تو شاید یہ خود فریبی کبھی پیچھا نہ چھوڑتی کہ نماز، روزہ اور دیگر ارکان اسلام کی ادائیگی سے اپنا پرائیویٹ تعلق خدا کے ساتھ قائم ہوگیا اور ہمارا دین مکمل ہوگیا۔ بہرکیف طلوع اسلام کا اجرا باقاعدگی کے ساتھ ہوا اور میں نے اپنی پوری توجہ اس طرف مبذول کرلی۔ مجھے یاد ہے۔ ایک دن بھائی جان کے ہاتھ میں ایک ضخیم کتاب نظر آئی۔ کتابوں کی دلدادہ تو تھی ہی۔ لپک کر ان کے پاس پہنچی۔ دیکھا تو کتاب کی دیدہ زیب جلد پر معارف القرآن کے جلی حروف نظر آئے۔ جناب پرویز کے منکر قرآنی کا وہ پہلا ماحصل اس کتاب کی صورت میں اہل نظر کو دعوت فکر دے رہا تھا۔ میں کہ اسوقت اگرچہ عقل ناپختہ رکھتی تھی اور فہم نارسا۔ میں نے آگے بڑھ کر معارف القرآن کو تھام لیا۔ بعد ازاں یہ سہارا اتنا سیدھا اور ایسا مضبوط ثابت ہوا کہ ڈگمگاتے قدم سنبھل گئے۔ معارف القرآن کو پڑھا بار بار سوچ سمجھ کر پڑھا اور دل و دماغ کے بند دریچے کھلتے چلے گئے۔ اسی کتاب کا دوسرا حصہ بازار میں آگیا اس کے ساتھ ساتھ طلوع اسلام کا مطالعہ جاری تھا یوں ذہنی طور پر پرویز صاحب سے رابطہ قائم ہوگیا۔ آہستہ آہستہ ان جامد عقائد میں ہل جل پیدا ہونی شروع ہوئی جو صدیوں سے متوارث چلے آرہے تھے اور نسلاً بعد نسلاً ذہنوں کی سطح پر کائی کی طرح جم چکے تھے۔ ان دنوں پرویز صاحب کا قیام دہلی میں تھا اور اپنا لاہور میں۔ کچھ خط و کتابت کے ذریعے اپنے عقائد کی درستگی میں مدد چاہی اور وقت گزرتا چلا گیا تا آنکہ ۵۳ء میں ہم بنگال پہنچ گئے اور پرویز صاحب کراچی تشریف لے گئے اس دوران میں ان کی بہت سی کتابیں شائع ہوچکی تھیں اور میں بنگال میں ان سے مستفید ہوتی رہی۔ انہی دنوں مجھے معلوم ہوا کہ پرویز صاحب نے درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا ہے یوں تو پرویز صاحب کو دیکھنے اور ان سے ملنے کی خواہش ان کی تحریروں کو پڑھنے کے ساتھ ہی جنم لے چکی تھی اور اس کی شدت میں ہر آن اضافہ ہو رہا تھا لیکن جب ان کے درس قرآن کی بابت سنا تو بے اختیار دل پکار اٹھا کاش مجھے بھی یہ موقع مل سکتا کہ میں ان کی زبانی قرآن کے حقائق کو سمجھ سکتی۔ مگر ابھی اس خوش نصیبی کا وقت نہیں آیا تھا۔ بنگال اور کراچی میں طویل فاصلے حائل تھے۔ ان کی بیش بہا تصانیف سے میں متمتع ہو رہی تھی لیکن درس قرآن سننا ابھی میری پہنچ سے بہت دور تھا۔ بنگال کے بعد ساڑھے تین سال کا عرصہ واہ میں گزر گیا اور آخر کار میری تمنا کی تکمیل کی ساعت سعید آگئی ہمارا تبادلہ ۵۹ء میں پھر سے لاہور ہوگیا۔ پرویز صاحب دو سال پہلے سے لاہور آچکے تھے اور یہاں بھی ان کے درس قرآن کا سلسلہ بدستور جاری تھا۔ یہاں پہنچتے ہی پہلی فرصت میں میں نے درس قرآن میں شمولیت کی سعادت حاصل کی۔ اس پہلے درس کو سن کر (کہ اس سے قبل کبھی ایسا درس سننے میں نہ آیا تھا)

حیرت و مسرت بھرے جذبات سے میرے دل کی جو کیفیت ہوئی اس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں، پرویز صاحب اپنے مخصوص و منفرد دل نشین انداز میں کسی پیچ و خم کے بغیر اس سادگی اور صفائی کے ساتھ قرآن کی حقیقتوں کو ذہن نشین کروا رہے تھے کہ ذہن جھوم جھوم اٹھا اور روح پر وجد طاری ہونے لگا۔ یا اللہ ہم نے قرآن کو کیا سمجھ رکھا تھا، قرآن تو یہ ہے۔ کلام اللہ تو ہمیں یہ تابندہ و پائندہ صراط مستقیم دکھا رہا ہے۔ ہم کن غلط راہوں پر بھٹک رہے تھے۔ اس ایک درس کو سننے اور سمجھنے کے بعد یہ ہو نہیں سکتا تھا کہ پھر اس روشنی سے منہ موڑ کر زندگی کے لمحات کو تاریک سے تاریک تر کرتی چلی جاتی۔

معزز حاضرین! معافی چاہتی ہوں کہ یہ آپ بیتی طویل ہو گئی لیکن آج کے دن پرویز صاحب سے لئے ہوئے درس قرآن پر اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے اس پس منظر کا سامنے لانا ضروری تھا جو ماضی کا رفیق رہا اور جس کے بعد یہ حال نصیب ہوا۔ ہم پچھلے پانچ سال سے اس درس قرآن سے ہر اتوار کو ہفتہ وار فیض یاب ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اس اپنی طرز کے یکتا درس سے ہمیں کیا کیا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ کیسے کیسے نکات ہم پر واضح نہیں کئے گئے۔ کس کس طرح ایک ایک لفظ کے معانی کے وہ وہ در نایاب ہمیں ارزاں نہیں ہوئے کہ جن کا ہم اپنے اس کوتاہ نظر و تنگ داماں ماحول کے درمیان کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ عقل و فہم کو اپیل کرنے والا درس، یہ دل و دماغ میں اتر جانے والی باتیں، یہ روشن دلائل و براہین کے ساتھ حق کی وضاحت کرنے والے اسباق۔ یہ اس قدر سلجھا ہوا انداز بیان کہ کسی مقام پر ذرہ بھر الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے غور و فکر کی سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار کرنے والی آیات بینات۔ بارالٰہا! تیرا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ تو نے اپنی کتاب کو موجودہ زمانے کی علمی سطح کے مطابق بے نقاب کرنے کے لئے ہمیں ایسا محقق عطا کیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ مذہب کیا ہوتا ہے اور دین کسے کہتے ہیں۔ اور اسلام خدا کے فرمان کے مطابق مکمل دین ہے۔ انسان کا ساختہ مذہب نہیں۔ وہ دین جس کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہے۔ جو انسان کی علمی و عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب بنتا ہے۔ جو اپنے ہر دعوے کو دلیل و برہان کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ جو انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ جو اسے حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور اس کے سطحی جذبات کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ جو خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔ وہ دین جو خدا کے بندے کو وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کا پیغام دیتا اور نظام خداوندی کو دنیا کے ہر نظام باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔ وہ دین جو ہماری اس دنیا کو سنوار کر ہمیں یہاں بھی جنت عطا کرتا ہے اور

مرنے کے بعد دوسری زندگی میں تھی۔ یوں اس محکم و مستحکم دین مبین کی حقیقت کبریٰ چمکتے دمکتے سورج کی طرح ہمارے سامنے آگئی۔

یوں، برادران عزیز! وہ ۱۹۶۰ء کا پہلا درس میرے لئے چراغ راہ بنا اور مجھے اس شفیق معلم کے زیر تعلیم لے آیا جس نے ہمیں غلط راہوں کی تاریکیوں سے نکال کر صحیح راستے کی روشنی کی طرف موڑا۔ ان درسوں کے علاوہ اگرچہ مفہوم القرآن کے پارے ساتھ کے ساتھ چھپ رہے ہیں۔ مگر ان کو خود پڑھ کر سمجھنے کے ساتھ پرویز صاحب کی زبانی سمجھائے ہوئے نکات سونے پر سہاگہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے بعض اوقات کسی ایک درس میں بھی شریک نہ ہو سکنا اپنے لئے ایک محرومی بن جاتا ہے اور اس کا افسوس مدتوں تک رہتا ہے۔

قرآن کی مشعل ہاتھ میں رکھتے ہوئے بھی صدیوں سے ہمارے مردوں نے ہم عورتوں کو اپنی محکومیت کے جس اندھیرے غار میں دھکیل رکھا تھا اس کے متعلق سوچ سوچ کر ذاتی طور پر مجھے بڑی تکلاہٹ اور جھنجھلاہٹ ہوتی تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر جہانوں کا مالک انصاف پسند خدا اپنے بندوں کے درمیان ایسی تفریق کیونکر روا رکھ سکتا ہے۔ الرجال قوامون علی النساء کے خود ساختہ مفہوم سے اس مسئلہ کا کوئی حل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مجبوراً ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو جانا پڑتا کہ شاید بارگاہ خداوندی نے اپنے لئے مردوں کو ہی مخصوص کر رکھا ہو۔ لیکن آخر کار یہ گرہ بھی کھل گئی اور پرویز صاحب کی نگہ حقیقت شناس نے اس عظیم الجھن کو بھی دور کر دیا۔ قرآن پاک کے دیگر الفاظ و آیات کی طرح اس اہم آیت کے بھی عربی زبان کی رو سے صحیح معانی اخذ کر کے حق و باطل کو نکھار کر علیحدہ علیحدہ کر دیا ہم نے جان لیا کہ خدا کے نزدیک جنسی تفریق نہ وجہ ذلت ہے نہ باعث امتیاز۔ نہ مرد محض مرد ہونے کی حیثیت سے عورتوں سے افضل ہیں نہ عورتیں، محض عورت ہونے کے سبب مردوں سے کہتر۔ زندگی کی ابتدا نفس واحدہ سے ہوئی جس میں لڑکی اور لڑکا دونوں شامل ہیں۔ دونوں نوع انسان کے افراد ہیں اور جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے اس میں مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر شریک ہیں۔ اور مردوں کو خدا نے عورتوں کا حاکم نہیں بلکہ خاندان کی روزی مہیا کرنے والا بنایا ہے۔ حیاتیاتی طور پر دونوں کی ساخت میں جو فرق ہے اس کی بنا پر دونوں میں تقسیم کار کا فرق ہے اور اس چنانچہ وحی خداوندی کے عطا کردہ اس نظریے کے ذریعے پرویز صاحب اس مظلوم جنس کے بھی چارہ ساز بنے جو محض قرآن کے الفاظ کو بغیر سوچے سمجھے بار بار دہرا لینے میں اپنی نجات تصور کرتی تھی۔

عزیز بہنو اور بھائیو! بلاشک وشبہ یہ ہم سب کی انتہائی خوش بختی ہے کہ اس گزرے ہوئے تمام عرصے میں جناب پرویز صاحب نے قرآن کے ان مول جواہر سے ہماری جھولیاں بھر بھر دیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عطیۂ خداوندی کے ملنے سے کیا ہم واقعی خوش بخت ہو گئے؟ ہم نے کبھی اپنی حالت کا جائزہ لیا؟ ہم بڑی باقاعدگی کے ساتھ یہاں درسوں میں شریک ہوتے ہیں۔ بڑی توجہ اور دھیان سے اس کو سنتے ہیں۔ قرآن کے اہم الفاظ کے بے پناہ وسعت لئے ہوئے مطالب کو سمجھنے پر عش عش کر اٹھتے ہیں۔ بعض مقامات پر جب ہماری دکھتی رگ پکڑی جاتی ہے تو ہماری حالت دگرگوں ہونے لگتی ہے۔ قرآنی احکام کے سامنے اپنے اعمال پر نظر ڈال کر ہماری آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں آنسو بھی چھلک پڑتے ہیں اور مجموعی طور پر اپنی قوم کی حالت کا خیال کر کے ہمارا رواں رواں کانپ اٹھتا ہے۔ لیکن۔ اور یہ لیکن بڑا تلخ ہے کہ۔ ہماری یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔ درس ختم ہو جاتا ہے تو گویا ہمارا کام بھی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ہم ہوتے ہیں اور ہمارے پیش پا افتادہ مفاد۔ ہمارے اپنے جذبات۔ ہمارے اپنے خیالات۔ اس طرح ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ہر آن، ہر سانس میں کبھی مسلمان ہوتے ہیں کبھی کفر اختیار کرتے ہیں اور آپ کو یاد ہوگا کہ قرآن کہتا ہے کہ ایسے لوگ اپنی اس تباہ کن روش کے بدترین نتائج سے ہرگز بچ نہیں سکتے۔ اور زندگی کی خوشگواریاں اور شادابیاں کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ اپنی اس لمبی چوڑی قوم پر نگاہ ڈالنے سے کیا نظر آتا ہے؟ اللہ اللہ! اس بہترین امت کو دنیا کی تمام قوموں کے اعمال پر نگران بنا کر بھیجا گیا تھا جو آج اپنے اعمال کے ہاتھوں دنیا کی تمام قوموں میں ذلیل و خوار ہو گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر بھی کوئی قیامت ہوگی؛ مگر ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ قانونِ مکافاتِ عمل ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔ ہم اس سے بچ نہیں سکتے۔ قرآن میں بنی اسرائیل کی عبرت انگیز داستان قدم قدم پر ہمیں اپنی تصویر دکھاتی ہے اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس امتِ مسلمہ نے خود کو تو ڈبویا ہی تھا اپنے ساتھ دیگر اقوام کو بھی لے ڈوبی۔ ایک درس میں جب پرویز صاحب نے اس آیتِ جلیلہ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا ضَلَالًا بَعِيدًا کی تشریح کی تو معلوم ہوا کہ ہماری موجودہ قوم کس طرح خدا کی راہ میں روک بن کر کھڑی ہے۔ ہمارا وجود دنیا کو دین کے ساتھ وابستہ کرنے میں کیونکر سنگِ گراں بنا ہوا ہے کہ یوں کہنے کو ہم مسلمان اور مومن ہیں لیکن دنیا کے سامنے اپنی زندگی کا جو نقشہ پیش کرتے ہیں، اس سے کسی غیر مسلم کو اسلام کی طرف رخ پھیرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ ایک طرف ہمارے دینِ قیم کے ٹھوس نظریات ہیں دوسری طرف ہمارے اعمال کا کھوکھلا پن۔ بھلا کون صاحبِ عقل وبصیرت مذہب کے ایسے گروہ میں شامل

ہوسکتا ہے۔ قرآنی تعلیم کے متعلق دنیا میں کسی سے بات کیجئے وہ اس کی صداقت و معقولیت کا قائل ہوجاتا ہے مگر اس کے بعد وہ یہ سوال کرتا ہے کہ اگر یہ ضابطۂ حیات تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے تو آپ جو اس کی تبلیغ کرتے ہیں خود کیوں ایسی مصیبتوں میں پھنسے ہوئے ہیں آپ کو اپنی مشکلوں کا حل اس سے کیوں نہیں ملتا۔ آپ پر زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں کیوں حرام ہوگئی ہیں؟ آپ کی اس زبوں حالی کا کون ذمہ دار ہے؟ ہمارے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟ ۔ دنیا اسی لئے اس طرف نہیں آرہی کہ ہماری یہ منافقت درمیان میں حائل ہورہی ہے۔ اللہ فرماتا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔ یقیناً منافقین جہنم کے سب سے نچلے درجے کے مستحق ہیں۔ یہ یہیں رکھے جائیں گے۔ اور وَلَنْ تَجِدَ لَھُمْ نَصِیْرًا ۔ ان کا کوئی رفیق اور مددگار نہیں ہوسکتا ۔ اس کے بعد اس حقیقت سے منکر ہونے کی جرأت کسے ہے کہ انسانیت کی بارگاہ میں آج ہم سب سے بڑے مجرم ہیں۔ اگر باوجود اس کے کہ ہم پرویز ایسے میر کارواں کی رہنمائی میں قرآن پر اندھا دھند ایمان نہیں لا رہے بلکہ اس پر غور و فکر کرنا سیکھ گئے ہیں، اپنے اعمال کو قوانین خداوندی کے تابع نہ رکھیں تو ہم سے زیادہ سوختہ بخت کون ہوگا! یہاں تو اللہ کی راہ پر صحیح قدم اٹھانے کی دیر ہے۔ پھر دیکھئے گا کہ سربلندی کا یہ راستہ کتنی تیزی سے بلند ہوتا چلا جائے گا۔

نہیں ہے نا امید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

آج ہیں اپنے دل اور اپنے خدا سے یہ عہد کرنا ہے کہ ہم نے آج تک اپنے محترم مسلم کی شبانہ روز کاوشوں کی بدولت جو کچھ حاصل کیا ہے اس کو ہر ساعت پیش نظر رکھ کر ہمیں پہلے اپنی ذات اور پھر اپنے معاشرے کو سنوارنا ہوگا۔ ہمیں جس صراط مستقیم پر لگایا گیا ہے اس پر ہمیں آگے آگے چلتے جانا ہوگا۔ اور ہمارا ہر قدم نظام خداوندی کے قیام کی خاطر اٹھے گا۔ یہی ہمارا نصب العین ہونا چاہیئے اور یہی مقصد زندگی۔

آخر میں خدائے ذوالجلال کے حضور میری دلی دعا ہے۔ نہ صرف میری یقیناً آپ سب کی بھی یہی دعا ہوگی۔ کہ ذات باری اس مرد درویش کو جو تند و تیز آندھیوں میں اس چراغ کو بہ حفاظت جلائے ہوئے ہے۔ اس قوم کی بہبودی کی خاطر صحت و تندرستی کے ساتھ عمر دراز عطا کرے اور ہم سب پورے عرصہ آن کی ضیاء باریوں سے دینِ رسول کی چھاؤں میں فیض یاب ہوتے رہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

اب بات سمجھ میں آئی

(محترمہ رشیدہ صلاح الدین صاحبہ)

صدر محترم و معزز سامعین!

پرویز صاحب کے لیکچر سننے سے پہلے جب بھی میں نے قرآن کریم کو سمجھنے کی کوشش کی میری نہ تو تسلی ہوئی اور نہ ہی میں کچھ سمجھ پائی۔ مثلاً چار شادیوں والی بات کو ہی لیجیے، یہ قرآن کہتا ہے؟ میرے اللہ! کیا یہ تیرا ہی دیا ہوا قانون ہے؟ پرویز صاحب نے جب بات سمجھائی کہ یہ تو محض جنگ کی ہولناکیوں کے نتائج کے پیش نظر اس وقت کا تقاضا تھا، اور وہ بھی اس مشکل ترین شرط کے ساتھ کہ "اگر تم انصاف کر سکو تو۔" اب کیجیے، تول تول کر محبت چار بیویوں کے ساتھ!۔

پھر یہ کہ اگر کوئی شخص خدانخواستہ مرجائے تو مولوی صاحبان سے بہت سی معافی کیساتھ) مولوی صاحبان کو بلا کر قرآن خوانی کروایئے۔ ان کو عمدہ عمدہ کھانے کھلایئے۔ ان دونوں باتوں کا ثواب اسی لمحے مرحوم کو منتقل ہونا شروع ہو جائیگا۔ یہ دونوں باتیں میری سمجھ سے تو بالاتر تھیں۔ آخر قرآن تو بہر صورت ایک ضابطۂ حیات ہے جسکے اندر دیئے ہوئے قوانین کے مطابق ہم سب کو بہتر زندگی گذارنے کیلئے عمل کرنا ہے۔ پھر اسکے محض پڑھنے یا پڑھوانے سے بھلا ثواب کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تو سراسر عمل کرنے کی چیز ہے۔

اور پھر یہ تو اور بھی مزے کی بات ہوئی کہ آپ ساری عمر جو جی میں آئے گناہ و ثواب جزا و سزا کے تصور سے بے نیاز ہو کر کرتے چلے جایئے۔ آپکے مرنے کے بعد آپکے عزیزوں کا پیسہ اور مولوی صاحبان کی ریاضت آپکو جنت میں لے جائیگی۔ حالانکہ قرآن کے مطابق ہمارا خدا نہ صرف کسی برے عمل کی ہی سزا دیتا ہے۔ بلکہ دل میں گزرنے والے برے خیال کا بھی محاسبہ کرتا ہے۔ اور نگاہوں کی خیانت تک کی سزا دیتا ہے یعنی اسکے قانون کے مطابق ان کا نتیجہ مرتب ہو کر رہتا ہے۔ اسی قسم کی وہ تمام باتیں اور رسومات جو ہمارے معاشرے میں قرآن و اسلام کے نام پر رائج ہیں۔ ہماری عقل انکو کبھی بھی تسلیم نہیں کرتی۔ اور نہ ہی قرآن سے ان کی سند ملتی ہے

پرویز صاحب کی مسلسل کوششوں و محنت سے ان سب کی وضاحت ہو جائیگی۔ بلکہ مجھے امید ہے کہ کچھ عرصے تک ہم سب اس عظیم ضابطے کو اس کے صحیح معنوں میں سمجھنے لگ جائیں گے۔ رب العزت انہیں اس عظیم کام کی تکمیل کیلئے لمبی زندگی دے اور ہم سب کو ان سے زیادہ سے زیادہ سیکھنے کی توفیق۔ (آمین)

میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

(محترم ظفر عباس قریشی صاحب)

کس قدر حسین ہے ہماری یہ تقریب سعید جس نے ہمیں یہ موقعہ فراہم کیا ہے کہ ہم مفکرِ قرآن جناب پرویز صاحب کے درسِ قرآن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔

قبل اس کے کہ میں اصل موضوع پر اظہارِ خیال کروں میں آپ کو اپنی زندگی کا ایک چھوٹا سا واقعہ سنانا ضروری سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک اس واقعہ کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس نے میرے خیالات کی دنیا میں ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ آج سے بیس سال پیشتر کی بات ہے کہ جب میں ایک دوپہر حسبِ معمول اسکول سے گھر لوٹا تو دیکھا کہ میری والدہ اور بہنیں مغموم بیٹھی ہیں۔ یوں تو ہمارے معاشرہ نے عورت کی دنیا کو رنج و الم کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے اس لئے تفکر و پریشانی اس غریب کا مقدر بنکر رہ گئی ہے۔ لیکن میری والدہ اور بہنوں کا آج اچانک یوں مغموم ہو جانا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ آج ہمارے ہاں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آج صبح سے میرے بڑے بھائی گھر سے غائب ہیں اور وہ ریل گاڑی کے ذریعے کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ یہ خبر سنکر مجھے بھی بڑا صدمہ ہوا اور میں خاموشی کے عالم میں اپنی اماں کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ہماری ایک پڑوسن جسے ہم خالہ کہتے تھے، ہمارے ہاں آئی۔ میری والدہ نے ان سے بھی میرے بھائی صاحب کے فرار کی داستان سنائی اور پھر ایک سرد آہ بھر کر کہا "نہ جانے میرا بچہ کس حال میں ہوگا۔ خالہ نے یہ بات سُنی تو امی جان سے کہا۔" تو اس میں پریشانی کی کونسی بات ہے۔ تم ابھی میرے ساتھ چلو۔ شاہ صاحب سے ذکر کرتے ہیں۔ وہ کوئی ایسا تعویذ دے دیں گے کہ بچہ شام تک گھر لوٹ آئے گا۔ یہ تو شاہ صاحب کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

یہ سنکر امی جان کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ انہوں نے فوراً برقعہ اٹھایا اور خالہ کے ساتھ چل پڑیں۔ چلتے ہوئے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ ہم شاہ صاحب کے پاس پہنچے۔ خالہ نے انہیں ہماری پریشانی کا حال سُنایا۔ شاہ صاحب

نے زعفران کی روشنائی سے ایک تعویذ لکھ کر والدہ صاحبہ کو دیا اور فرمایا۔" اس تعویذ کو لوبان کی دھونی دیکر کسی پاک کپڑے میں لپیٹ دینا اس کے بعد چرخے کے پہیئے میں باندھ دینا اور پھر چرخے کو الٹے چکر دیتی رہنا۔ اس کے دوران کسی سے کوئی بات نہیں کرنی اور دل ہی دل میں درود شریف پڑھتی رہنا۔ انشاء اللہ تمہارا بچہ الٹے پاؤں گھر لوٹ آئے گا" اس کے بعد شاہ صاحب نے ٹین کی ایک چھوٹی سی صندوقچی والدہ صاحبہ کے سامنے رکھ دی۔ انہوں نے سوا روپیہ تعویذ کے ہدیہ کے طور پر پاس میں ڈال دیا۔ اور گھر لوٹ آئیں۔ اس کے بعد رات گئے تک وہ غریب چرخے کے پاس سے نہیں اٹھی۔ دن بھر الٹا چرخہ چلاتے چلاتے ان کے بازو میں درد ہو گیا تھا۔ کافی رات گذر گئی اور ہم سب بہن بھائی سو گئے صبح اٹھے تو والدہ کو پھر اپنے اسی کام میں مصروف پایا۔ غرض یہ دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ چرخہ دو دن سے مسلسل الٹا چل رہا تھا۔ لیکن جانے والا الٹے پاؤں ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ شاہ صاحب نے تو یقین دلایا تھا کہ اس تعویذ میں چونکہ اللہ کا پاک کلام لکھا ہے اس لئے اس کی برکت سے میرے بھائی گھر لوٹ آئیں گے لیکن وہ ابھی تک نہیں لوٹے۔ نہ جانے اللہ کے کلام کی یہ کیسی برکت ہے؟ بھائی کو گھر چھوڑے پورا ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اور اس ایک ہفتے میں چرخہ برابر الٹا چل رہا تھا۔ کبھی والدہ اسے چلا رہی تھی اور کبھی بہنیں۔ ایک شام ایک عزیز ہمارے ہاں آئے اور انہوں نے بتایا کہ میرے بھائی کو انہوں نے دلی کی سبزی منڈی میں دیکھا تھا اور وہ وہاں اپنے کسی دوست کے پاس رہتے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی والدہ صاحبہ نے فوراً ہی دلی کی روانگی کا فیصلہ کر لیا چنانچہ وہ اسی رات کی گاڑی سے مجھے ساتھ لیکر روانہ ہو گئیں۔ دوران سفر میں نے والدہ سے دریافت کیا کہ شاہ صاحب نے جو تعویذ دیا تھا اس کا تو کچھ بھی اثر نہیں ہوا کہیں وہ تعویذ جھوٹا تو نہیں تھا۔" نہیں بیٹے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تعویذ میں اللہ کا پاک کلام ہوتا ہے اس میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اور یہ اسی کی برکت ہے کہ ہمیں تمہارے بھائی کا پتہ چل گیا۔" میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا اور زبان تک آنے سے پہلے ہی نہ جانے کیوں محو ہو گیا کہ اگر ہم تعویذ نہ بھی لیتے تو بھائی کا پتہ تو تب بھی چل ہی جاتا ... اس خیال کے مٹتے ہی ایک دوسرا خیال میرے ذہن کی سطح پر ابھر آیا اور میں نے والدہ سے پوچھا" امی! یہ شاہ صاحب تعویذ بیچتے کیوں ہیں۔ کیا اللہ کا پاک کلام بھی بکتا ہے؟ امی کی ایک ہی ڈانٹ نے اس خیال کو جو ابھی ابھی ذہنی سطح پر ابھرا تھا دل کی گہرائیوں میں غوطہ زن کر دیا۔

حضرات! اس قسم کے واقعات سے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اسلام اور قرآن کریم کے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں وہی بالآخر انہیں مذہب سے متنفر کر دیتے ہیں اور وہ مذہب کو مکڑی کا ایک ایسا جالا سمجھنے لگتے ہیں جس میں پھنس جانے کے بعد انہیں اپنی عافیت نظر نہیں آتی۔ اس لئے وہ اس کے قریب پھٹکنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ ایک عرصہ تک میری اپنی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی رہی۔ اور پھر خوش قسمتی سے ایک دن

"طلوع اسلام" کا ایک پرچہ میری نظر سے گزرا جس میں جناب پرویز صاحب کا تسلیم کے نام "ایک طویل خط تھا میں نے اس خط کو کئی بار پڑھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پرویز صاحب نے اس خط میں مجھے ہی مخاطب کیا تھا۔ مفکر قرآن جناب پرویز صاحب نے اس خط میں دین اور مذہب کے فرق کو بڑے ہی مؤثر اور دلکش انداز میں واضح فرمایا ہے۔ میرے دل میں اب پرویز صاحب کے لٹریچر کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور چند سالوں کے مطالعہ کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری مذہب سے بیزاری دراصل تلاش حقیقت کے لئے تھی۔ اور وہ حقیقت اب میری نگاہوں کے سامنے آشکارہ ہو چکی تھی۔ اب سے ساڑھے تین سال پیشتر جب میں کراچی چھوڑ کر لاہور آ رہا تھا تو یہ خیال میری روح اور میرے قلب و دماغ میں مسرتوں اور شادمانیوں کا ایک پیغام بن کر آ رہا تھا کہ لاہور میں رہ کر مجھے یہ موقعہ ملیگا کہ مفکر قرآن کے ہفتہ وار بصیرت افروز درس قرآن میں شرکت کر سکوں گا۔ اس وقت سے مسلسل درس میں شریک ہو رہا ہوں۔ میرے نزدیک اس درس قرآن کریم کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جناب پرویز صاحب قرآن کریم کو دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتے ہیں اور قرآن کریم کی آیات کی وضاحت خود قرآن کریم ہی کی دوسری آیات سے کرتے ہیں

ہمارے ہاں صدیوں سے قرآن کریم کو سمجھنے اور سمجھانے کا جو طریقہ چلا آ رہا ہے، معاف کیجئے اس نے قرآن کی آیات کو ایک بھول بھلیاں بنا کر رکھ دیا ہے۔ اسی وجہ سے یہ خیال پیدا ہونے لگا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن کریم تضادات کا ایک مجموعہ ہے اور اسکی آیات اور ان کے مفہوم بالکل بے ربط ہیں۔ لیکن پرویز صاحب کے درس قرآن نے ان گمراہ کن خیالات کو یکسر باطل قرار دیکر یہ ثابت کر دیا ہے کہ خدا کا پاک کلام تضادات سے پاک ہے اور اس کی آیات اور مطالب میں باہمی ربط ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی آیات جنکا مفہوم ہم مروجہ تراجم میں پڑھتے چلے آتے ہیں اور متعدد بار علماء سے سن چکے ہیں، میرے دل میں عجیب کشمکش پیدا کر رہی تھیں اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر ان آیات کا مفہوم وہی ہے جو مدعیان مذہب بیان کرتے ہیں تو پھر آخر ان آیات کا ہماری اپنی زندگی سے کیا واسطہ ہے جو انہیں نازل کیا گیا۔ لیکن یہی آیات جب اس درس میں میرے سامنے آئیں اور ان کا مفہوم جناب پرویز صاحب نے بیان فرمایا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان آیات کا ہماری زندگی سے خاص تعلق ہے اور ہم بھی ان آیات کے مخاطب ہیں۔

قرآن کریم کی بعض آیات کا جو مفہوم ہم آجتک سنتے چلے آئے ہیں اس نے ہمارے دلوں میں خدا تعالیٰ اور قرآن کریم کے متعلق بہت سے شکوک پیدا کر رکھے تھے۔ "وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ" کا مفہوم ہر منبر اور ایٹج سے یہی سنتے چلے آئے ہیں کہ "خدا جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔" اس سے

بار بار دل میں یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ یہ کس قسم کا خدا ہے جس کا نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون اور جو نعوذ باللہ ایک ڈکٹیٹر کی طرح آسمانوں پر بیٹھ کر جو جی میں آتا ہے کرتا ہے۔ جب موڈ (MOOD) میں آتا ہے تو ایک شخص کو عزت کے مقام بلند تک پہنچا دیتا ہے اور جب جی میں آیا اسی کو ذلت و رسوائی کے عمیق غار میں دھکیل دیتا ہے۔ کم از کم آیت بالا کے مروجہ سے مفہوم سے تو یہ ہرگز ظاہر نہیں ہوتا کہ عزت و ذلت کا کوئی معیار خدا نے مقرر کر رکھا ہے۔ بار بار دل میں خیال آتا تھا کہ یہ کردار کسی انسان کا تو ہو سکتا ہے خدا کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب اس آیت کا مفہوم اس درسِ قرآن کریم میں جناب پرویز صاحب کی زبانی سنا تو روح میں وجد آگیا اور معلوم ہوا کہ عزت و ذلت کا ملنا خداوندِ عالم کے قانون کے مطابق ہوتا ہے اور عزت کا مستحق وہ ہوتا ہے جو اسکے قانون کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ ایک اور آیت کو لیجئے "واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب"۔ اسکا مفہوم آجتک یہی سنتے چلے آئے ہیں کہ اللہ جسے چاہتا ہے بے حد و بے شمار رزق دیتا ہے۔ غرض آیاتِ قرآنی کے مروجہ مفہوم نے دل میں عجیب کشمکش پیدا کر رکھی تھی۔ لیکن جب اس قسم کی آیات کا مفہوم اس درس میں سنا تو خدائے تعالےٰ اور قرآن کریم کے متعلق جو شکوک اور شبہات پیدا ہو چکے تھے اور جن کی بدولت خود اسلام سے دل بیزار ہو رہا تھا، یکسر دور ہو گئے اور میرا سر نیاز بارگاہِ خداوندی میں جھک گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس درسِ قرآن نے ان تمام حقائق کو بے نقاب کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے جن پر ہمارے قدامت پرستوں اور عجمی روایات نے دبیز پردے ڈال رکھے تھے۔

حضرات! محترم پرویز صاحب کو اللہ تعالیٰ نے جو قرآنی بصیرت عطا فرمائی ہے ان کی اس بصیرت نے قرآن کریم اور اسلام کی صحیح تصویر ہمارے سامنے پیش کر دی ہے اور اب ہم اس قابل ہو چکے ہیں کہ قرآن کریم کے حقائق کو بے نقاب دیکھ سکیں اور انہیں اپنی زندگی کے لئے مشعلِ راہ بنا سکیں۔

حضرات! درسِ قرآن سے متعلق اپنے تاثرات بیان کرنے کے بعد جناب پرویز صاحب کے متعلق یہ دعا میرے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر لبوں تک آپہنچی ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

میرے تاثرات

(محترم چوہدری محمد اشرف صاحب)

حاضرینِ کرام — سلام و رحمت !

بزمِ طلوعِ اسلام" لاہور مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے یہ تقریب منعقد کر کے جناب پرویز صاحب کے درس میں شامل ہونے والے احباب کو یہ موقعہ دیا ہے کہ وہ درس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

میں اکثر یہ سوچا کرتا ہوں کہ اگر مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب ہمیں غفلت کی نیند سے نہ جگاتے تو نہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا بسنِ شعور کو پہنچنے کے ساتھ ہی قرآن کریم کی طرف میں نے اپنے آپکو راغب پایا۔ اکثر مساجد میں قرآن کے درس سُنے۔ بڑے بڑے علماء کو سُنا۔ ایسے حضرات کے درس بھی سُنے جن کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ بڑے جیّد عالم ہیں۔ لیکن معاف فرمایئے میری اس حق گوئی کو کہ کبھی اطمینانِ قلب نصیب نہ ہو سکا۔ جب بھی اس قسم کے درس سُنے یہی معلوم ہوا کہ قرآن کریم ایک تاریخ کی کتاب ہے جس میں مختلف ادوار اور بیشتر قوموں کے واقعات درج ہیں۔ یا یہ کہ یہ کتاب انبیاءِ کرامؑ کے واقعات سے لبریز ہے بچپن سے بلوغت تک جنوں اور بھوتوں کی کہانیاں سُنتے چلے آئے تھے۔ جوان ہوئے تو سوچا کہ اب ہم کہانیاں سننے کی عمر سے نکل چکے ہیں۔ اب ہمارے ناپختہ ذہن بھی پختگی کی منزل تک آپہنچے ہیں اس لئے اب ہمیں کہانیوں کی نہیں بلکہ حقائق کی ضرورت ہے۔ لیکن واسئے برحال ما کہ اس منزل پر پہنچ کر بھی کہانیوں نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ یہ ضرور ہوا کہ اب جنوں اور بھوتوں کی کہانیوں کی بجائے سابقہ اقوام کے واقعات کہانیوں کی طرح سنائے جانے لگے۔ اس عالم میں اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ قرآن کریم کوئی تاریخی کتاب ہے تو اس میں آپ ہی سوچئے کہ سمجھنے والے کا کیا قصور ؟

خوش قسمتی سے میں اپنے چچا جان کی وساطت سے ایک دن جناب پرویز صاحب کے درسِ قرآن

ہیں شامل ہو گیا۔ یقین جانئے کہ اس پہلے ہی درس نے میرے خیالات کی دنیا ہیں کافی حد تک تبدیلی پیدا کر دی۔ اس کے بعد مسلسل درس میں شریک ہونے لگا اور ہر بار قرآن کریم کے حقائق نکھر کر سامنے آنے لگے۔ پرویز صاحب کے ایک ایک لفظ نے اس خیال کو باطل ثابت کر دیا کہ قرآن کریم تاریخی واقعات کی کوئی کتاب ہے۔ میں جو کچھ پرویز صاحب کے درس سے حاصل کر چکا ہوں اس مختصر سے وقت میں وہ سب کچھ تو بیان نہیں کیا جا سکتا البتہ مختصر الفاظ میں یہ ضرور کہوں گا کہ جناب پرویز صاحب کے درس نے قرآن کریم کی عظمت کا سکہ ہمارے دلوں میں بٹھا دیا ہے۔ اب ہم یہ سمجھ چکے ہیں کہ خدا کی یہ زندہ و پائندہ کتاب انسانی زندگی کے لئے ایک ایسا عظیم ضابطۂ حیات ہے جو انسانیت کو وہ حسین معاشرہ دیتا ہے جس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ انسانیت جس تذبذب اور پریشانی کی زندگی گزار رہی ہے یہ صرف قرآن کریم ہی ہے جو اس کی زندگی کو مسرت اور خوش گواری میں تبدیل کر سکتا ہے۔

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات

کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی شائع کردہ کتب محترم پرویز صاحب کی مطبوعات اور تحریک کا لٹریچر حسب ذیل پتہ سے مل سکیگا۔

محمد اسلام صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام ۸۰۰ الوئس روڈ نیو ٹاؤن کراچی۔ فون نمبر ۲۳۵۸۸۰

علاوہ بریں ہر اتوار کی صبح کو سندھ اسمبلی ہال دہند رروڈ کراچی میں پرویز صاحب کے درس قرآن کریم کے موقع پر بھی تحریک کا لٹریچر اور ضروری مطبوعات مہیا کی جاتی ہیں۔

مفت!

مجرب دوا برائے دمہ۔ درد گردہ۔ پتھری

ملنے کا پتہ:۔ حاجی محمد دین سیٹھ آئس فیکٹری متصل گنیش کمپونڈ ملز لارنس روڈ کراچی
نوٹ:۔ جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

(محترم راجہ محمد اکرم صاحب۔ ایڈووکیٹ)

پھر اس انداز سے بہار آئی ۔ کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنان خطہ خاک ۔ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

برادران عزیز! خالق کائنات نے جب عالم انسانیت کو قرآن کی روشنی سے منور کیا تو خود فرمایا کہ اے نوع انسانی جاؤ خوشیاں مناؤ۔ ہم نے تم کو بہت بڑی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ یوں تو زندگی کے ہر لمحہ میں خدا کے اس عظیم عطیہ کے شکریے میں ہمارے سر جھکے رہتے۔ اور ہمارے قلب و دماغ سکون و فرحت کے ساتھ ہمکنار رہتے ہیں۔ لیکن آج ہم سب پھر ایک بار اکٹھے ہوئے ہیں تاکہ سب مل کر شکرانہ بجا لائیں اور اظہار مسرت و شادمانی کریں اور ساتھ ہی یہ بھی دیکھیں کہ ہم نے کس حد تک اپنے آپ کو اس نعمت عظمیٰ کا مستحق ثابت کیا ہے۔

برادران! آج کا یہ اجتماع میرے لئے باعث صد سکون دل و نظر ہے۔ کہ میں اس منظر کو درخشندہ طور پر اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں کہ

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
جھک کے پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن!

اور آج آپ کی اجازت سے میں اپنی ہی زندگی کے چند اوراق الٹنا چاہتا ہوں۔ برادران! آپ جانتے ہیں کہ ہمارے گھرانوں میں بچپن ہی سے نماز، روزے کی تلقین کی جاتی ہے۔ اور قرآن مجید بھی پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ کچھ کرنے سے آخرت سنور جاتی ہے۔ اور جب مولوی ہمیں ہجوں کے ذریعے قرآن کریم کے تیس پارے (بغیر معانی سمجھنے کے۔ کیونکہ معانی انہیں خود بھی نہیں آتے ہونگے) پڑھا کر ختم کرا دیتے ہیں تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ مذہبی کورس کا بیشتر حصہ مکمل کر لیا گیا ہے اور پھر اگر ہر روز بیچ ایک دو رکوع اسی انداز سے تلاوت کئے جائیں تو بس آخرت کا میدان مار لیا۔ اور کسی نے آخرت اور زیادہ سنوارنی ہو

تو اُسے چند اور مسائل جاننے کے لئے "پکی روٹی" "بہشتی زیور" پیش کی جاتی ہے۔ برادران! میں نے بھی یہ سب کچھ کیا۔ صدق دل کے ساتھ اور جذب و شوق کے ساتھ کیا۔ قرآن مجید کی آخری دس سورتیں حفظ کر کے اپنے گھر والوں میں عزت بھی حاصل کی۔ اور سب کو اطمینان ہو گیا کہ میں اب مذہب کا پوری طرح پابند ہوں۔

لیکن جُوں جُوں وقت گذرتا گیا۔ دُنیاوی تعلیم بڑھتی گئی۔ میرے ذہن اور سوچ انگڑائیاں لینے لگے تو ذہن کے اُفق پر نئے نئے سوالات نمودار ہونے لگے۔ اب تک جو مذہبی تعلیم حاصل کی تھی وہ ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر تھی۔ اگر کسی مولوی صاحب سے کچھ سوالات پوچھے جاتے تو یہ کہہ کر چُپ کرا دیا جاتا کہ یہ خدا کے احکام ہیں۔ ان کو صرف مانا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں تفتیش نہیں کی جاتی۔ برادران! ایسی صورت حال میں آدمی مذہب اور اس کے دیئے ہوئے دوزخ کے تصور سے ڈر کر چپ تو ضرور ہو جاتا ہے لیکن وہ سوالات حل نہیں ہوتے۔ بلکہ بار بار اٹھتے ہیں اور کانٹے بن کر ذہن میں چبھتے رہتے ہیں اور عقل و فکر رکھنے والا انسان ایک عجیب عذاب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ برادران! تعلیم جب سکول سے کالج کے معیار پر آئی تو تجسس و تفتیش کا مادہ نہ صرف پھیلا کرتا آیا بلکہ اس میں اور اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں چند پمفلٹ اور چھوٹے چھوٹے کتابچے ملے جن کے عنوان کچھ اس قسم کے تھے "نماز کیا ہے" "روزہ کیسے کہتے ہیں" "قربانی کے فضائل" "حج کے مسائل" اور "زکوٰۃ کی فضیلت" اور دعوے یہ کیا جاتا تھا کہ ان کتابچوں کو پڑھ لینے سے علم و عقل میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے اور نوجوانوں کے دل و دماغ میں اُٹھنے والے تمام سوالات کے مکمل اور تسلی بخش جوابات ان میں موجود ہیں۔ اور شک و شبہات کی تمام بیماریوں کے لئے یہ پمفلٹ اور کتابچے اکسیر خاص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ برادران! ان تمام کتابوں کو بصد اشتیاق پڑھا اور اس یقین کے ساتھ پڑھا کہ بس اب معاملہ حل ہو گیا۔ لیکن افسوس سے عرض کرنا پڑتا ہے کہ نتیجہ دعوے کے بالکل برعکس نکلا۔ ایک ہی چیز بڑھی۔ بے یقینی۔ اس لٹریچر پر پمفلٹ جاری کرنے والے گروہ سے بھی واسطہ پڑا۔ یہ وہ جماعت ہے جو مذہب کی دکان لگا کر سیاست کا سودا بیچتی ہے۔ اور یہ انکشاف بھی بڑا ہی دل شکن تھا کہ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب واقعی ایک افیون نظر آنے لگا۔ جسے ہر شاطر و عیار دوسروں کی عقل و فکر کو ماؤف کرنے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ تاکہ وہ اس کے جبر و استبداد کی زنجیروں کو مقدس سمجھ کر اپنے مژگان عقیدت سے چمٹائے رکھیں۔ اور اس حسین فریب میں مبتلا رہیں کہ ان میں جکڑے رہنا عین آزادی ہے۔ برادران! اس ذہنی پس منظر کے ساتھ ۱۹۵۱-۵۲ء میں لا کالج کراچی میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے میں نے داخلہ لیا۔ اس ماحول میں پھر "مذہب اور سیاست" کی گفتگو کانوں میں پڑنے لگی۔ پھر یہ بات موضوع سخن بنی کہ ہم نے پاکستان کیوں حاصل کیا تھا۔ صرف اس لئے کہ اسلامی

حکومت قائم کریں گے۔ میں ایسی باتوں سے بالکل بیزار تھا۔ اور میرے کان اس قسم کی گفتگو سننے سے انکار کرتے تھے۔ میں مذہب کے اژدھا سے ایک بار پھر ڈسے جانے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ اور کالج میں جو طبقہ یہ دام لگا کر اوروں کو پھنسانا چاہتا تھا وہ اسی جماعت کا "سٹوڈنٹ ایڈیشن" تھا جس کا ذکر میں ابھی ابھی کر چکا ہوں۔

اسی دوران میں میرے ایک محترم دوست نے جب مجھے "مذہب" سے اس قدر متنفر و بیزار دیکھا تو کچھ کرید کی۔ آخر ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ یہاں قریب ہی ایک جگہ ایک صاحب انوار کی صبح کو مختلف موضوعات پر لیکچر دیتے ہیں۔ ایک دن چلا جائے۔ لیکن میری طرف سے جواب کوئی حوصلہ افزا نہ تھا۔ انہوں نے کئی بار اصرار کیا۔ میں نے ہر بار انکار کیا۔ اور میرا جواب یہی ہوتا تھا۔ "جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد۔ پر طبیعت ادھر نہیں آتی"۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان وادیوں میں عقل و شعور کا کافی حصہ کھو چکا تھا۔ اور جو کچھ اتفاق سے باقی بچ گیا تھا اسے کسی کو بطور نذرانہ پیش کرنے کے لئے تیار نہ تھا اس لئے اپنے اس دوست کے بار بار کے اصرار کے باوجود میں اس کے ساتھ جانے کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ کسی کی کوئی بات سن لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔ ان کی اس ترغیب پر میں ان کے دامن کا سہارا لے کر ان کے ساتھ ہو لیا اور چلتے چلتے "فاؤلر لائبریری" پہنچ گئے۔ کچھ حضرات پہلے سے موجود تھے۔ میں بھی سب سے پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔ اس خیال سے کہ یہ مرحلہ بھی جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ چند ہی منٹ بعد ایک محترم بزرگ۔ جن کی ظاہری وضع قطع سے زہد و تقدس کا کوئی رعب نہیں پڑتا تھا۔ بغیر کسی عصا یا رومال کے۔ بالکل سادہ لباس میں۔ چند کتابیں ہاتھ میں لئے تشریف لائے۔ میں ایسی صورت حال سے کچھ زیادہ مانوس نہ تھا۔ اس لئے چند منٹ تک ان کی شخصیت کے بارے میں کوئی رائے جلدی سے قائم نہ کر سکا۔ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز کچھ اس طرح کیا "سلسلہ کلام یوں تھا....." اور غالباً داستان بنی اسرائیل کی کچھ کڑیاں پیش کی تھیں۔ اور بیچ میں فرقہ پرستی کا ذکر بھی آیا تھا چند ہی منٹ کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ان کی تقریر کا ایک ایک لفظ میرے دل و دماغ پر نقش ہوتا جا رہا ہے۔ میں تقریر کی شیرینیوں میں جذب ہو چکا تھا۔ اور میرے دل کی دھڑکنوں نے نیا انداز اپنانا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ دبے پاؤں کوئی انقلاب مجھے اپنے لپیٹ میں لے رہا تھا۔ میں ابھی اس اعجاز کے سحر میں گم تھا کہ وقت گذرنے کا احساس ہوئے بغیر ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا۔ اور محترم مقرر نے ربنا تقبل منا..... کے الفاظ سے اپنی تقریر ختم کی..... میں اپنی کرسی پر بیٹھا چند منٹ تک لذت تقریر سے کیف اندوز ہوتا رہا۔ اور میرے دل و دماغ اس بات کی شہادت دے رہے تھے کہ آج کچھ نئی منزلوں کا نشان

ملا ہے۔ نئے دوستوں کا پتہ چلا ہے۔

جب میں اُٹھ کر صحن سے باہر نکلا تو وہ میرے دوست میرا ردعمل معلوم کرنے کے لئے بیتابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے فوراً سوال کیا کہ "کیا خیال ہے؟" اور میرے منہ سے اقبالؒ کا یہ شعر بیساختہ نکل گیا۔

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

برادران! مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اگر تیرہ سو برس پہلے اس قرآن کی چند آیتیں عمرؓ کی زندگی کا رخ موڑ سکتی تھیں تو آج بھی وہ ہر قلب سلیم کے لئے وہی مقناطیسی قوت رکھتی ہیں۔ اور یہ ضابطہ ہدایت زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہے۔ اور زمانے کی رو کو بدل سکتا ہے۔

برادران! یہ دن میری زندگی میں ایک سنگِ میل تھا۔ نہیں یہ ایک نیا اور عظیم موڑ تھا۔ اور اگر میری خوش بختی میرے لئے اس موڑ سے نئی راہ پر چلنے کا بندوبست نہ کرتی تو آج میں قرآن کی بارگاہ سے کہیں دور ایک بھٹکا ہوا راہی ہوتا۔

"قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ انسانیت کو تاریکی کے غار سے نکال کر روشنی کے میدان میں کھڑا کرتا ہے" تاکہ انسانیت اپنے صحیح مقام سے آشنا ہو جائے۔ میں نے وہاں سے لوٹنے کے بعد کچھ کتابوں کا پتہ کیا تو "سلیم کے نام" پڑھنے کا مشورہ دیا گیا۔ اور کتاب بھی دی گئی۔ میں نے اسی دن پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں میں کتاب پڑھتا جاتا تھا۔ میرے دل و دماغ کی دنیا میں تبدیلی واقع ہوتی جاتی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کوئی میرے پاس بیٹھا میرے عقل و فکر سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ اور دعوت غور و فکر دے رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا ہے کہ وہ بے جان عقائد اور بے روح رسمیں، جن سے تم متنفر ہوئے ہو۔ وہ مذہبی اجارہ داروں کی ضد، جہالت اور تعصب کی پیداوار ہیں۔ انہیں خدا کے اُس دین سے دور کا بھی واسطہ نہیں جو ساری انسانیت کی ہر طرح کی نشوونما کے لئے خدا کی طرف سے حضور نبی اکرمؐ کی وساطت سے انسانیت کو دیا گیا۔

اور یہ نہیں کہ مذہب کے عقائد کی طرح' ان اصولوں کو آنکھ بند کر کے مانا جاتا ہے۔ اور ان پر "کیوں" کی انگلی نہیں اُٹھائی جاتی۔ اس کا تقاضا یہ کہ اس کے اصولوں کو غور و فکر کے بعد دل و دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت تسلیم کیا جائے۔ اس طرح سے جو یقین محکم دل و دماغ میں جاگزین ہو

صرف وہی ایمان کہلائیگا۔ اور یہ کہ دین کے تمام بنیادی اصول قرآن کریم میں خدا نے اپنی قدرت کاملہ سے نازل فرما دئے ہیں۔ ان کو سمجھنا کسی خاص گروہ اور خاص زمانے کی اجارہ داری نہیں۔ ہر زمانے کا انسان انہیں اپنے زمانے کی علمی و عقلی سطح پر سمجھ اور پرکھ سکتا ہے۔ اور ہر زمانے کے تقاضوں کا جواب ان اصولوں میں ملے گا۔ اور جو ان اصولوں کے مطابق اپنی زندگی بسر نہیں کرے گا وہ دین کا منکر ہوگا

و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون

اور یہ کہ انسانیت ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔

یہ پہلا سبق تھا کتاب ھدیٰ کا ۔ کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا

کان الناس امۃ واحدۃ۔

اور انسانیت جن مختلف گروہوں میں بٹ چکی ہے اُسے مذہب کی سند تو حاصل ہو سکتی ہے لیکن یہ خدا کے دین کی مخالفت ہے۔

اور یہ کہ دین بندہ اور آقا کے تصوّر کی نفی کرتا ہے۔

تمام انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں اور قابل تعظیم ہیں و لقد کرمنا بنی آدم۔ اور معاشرہ میں پوزیشن اور درجات محض ذاتی صلاحیتوں اور سیرت و کردار کی بنا پر حاصل ہونگے دین میں نہ کوئی چیف پادری ہے۔ نہ اختیار غصب کرکے بیٹھ جانے والا بادشاہ۔ ان دونوں کے ناپاک گٹھ جوڑ کو مذہب تو اپنی منظوری دے دیتا ہے۔ اور انسانیت کا گلا گھٹتا چلا جاتا ہے۔ لیکن دین ان دونوں قوتوں کا گلا دباتا ہے۔ اور قوم کی رہنمائی اور خدمت سب سے بہتر شخص کے سپرد کرتا ہے۔

اور یہ کہ خدا داد صلاحیتوں سے خدا کی زمین سے رزق کے انبار جمع کرکے کوئی شخص یا گروہ اس کے اوپر سانپ کی طرح نہیں بیٹھ سکتا۔ مذہب اسے اپنے حیلوں بہانوں سے جائز قرار دے سکتا ہے۔ لیکن خدا کا دین حکم دیتا ہے۔ کہ انفقوا مما رزقنکم۔ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے منفعت عامہ کے لیے کھلا رکھو۔

برادران عزیز! جوں جوں یہ کتابیں مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ میں قرآن کے قریب ہوتا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ واقعی گھٹاٹوپ اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آکھڑا ہوا ہوں۔ اور یہ بھی بالکل واضح ہوگیا کہ دین پر کوئی شخص انفرادی طور پر عمل نہیں کر سکتا۔ یہ تو ایک نظام پیش کرتا ہے جسے افراد معاشرہ نے مل کر قائم کرنا ہے۔ اور یہی وہ نظام ہوگا جہاں تمام افراد معاشرہ کو اپنی ذات کی نشوونما کے لیے پورا پورا موقع یکساں طور پر میسر ہوگا۔ انسانیت امن و سکون کا سانس لے گی

اور مستزلوں کا جھولا جھولے گی۔ اب تو دل میں یہ آرزو شدت اختیار کرتی جا رہی ہے کہ خدا وہ دن جلد لائے جب ایسا معاشرہ قائم ہو جائے اور ہم اس جنت ارضی کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

میرے ایک بزرگ دوست، جنہیں اخبارات "ایک عظیم دانشور" کے نام سے بھی لکھا کرتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ (QURAN HAS TO BE RE-REVEALED TODAY) یعنی قرآن کو ہم نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق سمجھنا ہے۔ محترم پرویز صاحب نے ہم سب کو قرآن سے متعارف کرایا ہے۔ اس کی بارگاہ میں ہمیں لا کھڑا کیا ہے اور ہمارے دل و دماغ کو وہ آزادی اور سکون و اطمینان نصیب ہوا ہے جو صرف قرآن کی بارگاہ میں مل سکتا ہے۔ محترم پرویز صاحب کا احسان ہم ہی پر نہیں بلکہ دورِ حاضر کی پوری انسانیت اور آئندہ آنے والی نسلوں پر ہے۔ اب ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام خدا کا آخری دین ہے۔ (مذہب نہیں)۔ اور دنیا و آخرت کی خوشگواریوں کی ضمانت صرف یہی دین دے سکتا ہے۔ اس پر ہم جتنی بھی خوشیاں منائیں کم ہیں۔

میں دعا کرتا ہوں کہ خدا پرویز صاحب کو صحت اور عمر بخشے کہ وہ اپنے مشن کی تکمیل کر سکیں۔ (والسلام)

لاہور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

ہر اتوار کی صبح —— ۸ ½ بجے ۲۵/بی گلبرگ میں شروع ہوتا ہے — (نمائندہ بزم لاہور)

لائل پور میں پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

ہر جمعہ کی شب کو نماز عشاء کے بعد، نمائندہ بزم، خان محمد اکرم خان کی قیام گاہ ۵۔۸۰۔بم۔ اے (پنجاب ڈیریز) پیپلز کالونی میں ہوتا ہے!

منزل ملی ۔ مقام ملا ۔ مدعا ملا

(محترمہ مس شمیم انور لیکچرار۔ کنیرڈ کالج کی انگریزی تقریر کا آزاد ترجمہ)

خواتین و حضرات !

اس سے پہلے میں آپ کی خدمت میں جو کچھ پیش کیا کرتی تھی وہ جگ بیتی ہوتی تھی۔ آج جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ آپ بیتی ہے۔ اور جب میں یہ خیال کرتی ہوں کہ کسی کی آپ بیتی سے دوسروں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے تو یہ احساس گلوگیر ہو جاتا ہے کہ کہیں آپ اُکتا کر یہ کہنے پر مجبور نہ ہو جائیں کہ

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ
و! آج کی شب بھی سو چکے ہم

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال میری جرأت بڑھاتا ہے کہ جب ہم آج کی محفل میں قرآن کی باتیں کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں تو ہمیں اپنی باتیں کرنے سے مفر کس طرح ہو سکتا ہے ؛ اس لئے کہ قرآن کا بھیجنے والا خدا ہم سے کہتا ہے کہ فِیْہِ ذِکْرُکُمْ (۲۱/۱۰) اس میں خود تمہارا ہی ذکر ہے۔ اس زندگی کے ڈرامے کے ہیرو اور ہیروئن تمہیں ہو۔ اس لئے قرآن کی باتیں کرتے ہوئے ہم آپ بیتی سے الگ ہو نہیں سکتے۔

حکایت قدِ آں یارِ دلنواز کنم !
بایں بہانہ مگر عمرِ خود دراز کنم !

خواتین و حضرات !

آج کی محفل میں ہم سے پوچھا یہ جا رہا ہے کہ ہم نے قرآن کی بارگاہ سے کیا حاصل کیا ! اور دل کا تو میں کہہ نہیں سکتی۔ مجھے اس بارگاہ سے اتنا کچھ ملا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کہاں سے بات شروع کروں اور اسے لفظوں میں سماؤں کس طرح ! اس لئے کہ یہ وہ داستان ہے

جس کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ — سمٹے تو میرا دل ہے۔ پھیلے تو زمانہ ہے — میں کوشش کروں گی کہ اپنے تاثرات کم از کم الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کروں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اتنا عرض کرنے کی جرأت بھی کروں گی کہ میں اپنے متعلق — یا قرآن کے ضمن میں آپ کے متعلق — جو کچھ کہوں گی برملا کہوں گی۔ لگی لپٹی رکھے بغیر کہوں گی۔ اس لئے کہ اس کے بغیر نہ میں بات سمجھا سکوں گی۔ نہ آپ سمجھ سکیں گے — اور پھر ہمیں قرآن نے ہی تو سکھایا ہے کہ قولوا قولا سدیداً بات دو ٹوک کرو۔

میری اس آپ بیتی کے دو حصے ہیں۔ ایک کا تعلق زمانۂ قبل از طلوعِ اسلام سے ہے۔ اور دوسرا حصہ زمانۂ بعد از طلوعِ اسلام سے متعلق ہے۔ پہلے زمانۂ قبل از طلوعِ اسلام کی بات سنئے۔

میرے قلب و دماغ کی اضطرابیوں کا آغاز اس وقت ہوا جب مجھ پر پہلے پہل یہ حقیقت بے نقاب ہوئی کہ مجھے اپنے آپ کو زندگی کی بہت سی حیات بخش شیرینیوں سے محروم رکھنا پڑے گا۔ اور جنتِ آدم کے کئی گوشوں میں میرا داخلہ ممنوع ہوگا — محض اس جرم کی پاداش میں کہ میں اُس حوا کی بیٹی ہوں جس نے آدم کو جنت سے نکلوایا تھا — یعنی اس جرم کی پاداش میں کہ مجھے خدا نے عورت پیدا کیا۔ میں انسانیت کے بنیادی حقوق کے حصول۔ فطرت کی عطا کردہ قلب و دماغ کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشوونما۔ اور اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کے ذرائع و وسائل کے جس دروازے پر پہنچی مجھے یہ کہہ کر دھتکار دیا گیا کہ پیچھے ہٹ جاؤ۔ تم ان مقدس آستانوں کو چھو نہیں سکتی۔ اس لئے کہ تم عورت ہو!

اور جب میں نے کبھی کسی کام کے لئے گھر سے باہر نکلنے کے لئے قدم اٹھایا تو غیر محفوظ ہونے کا احساس ہر سمت سے چھلاوے کی طرح آگے بڑھ کر ڈرانے لگا۔ قدم قدم پر خوف۔ سانس سانس میں ہراس۔ نس نس میں دہشت! سوچئے تو سہی کہ اس قسم کی فضا میں، زندگی کا کوئی ولولہ۔ کوئی حوصلہ۔ کوئی آرزو باقی رہ سکتی ہے؟ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا ہی نہیں۔ خود کائنات کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ زندگی دم توڑ رہی ہے۔ آرزوں کی ہڈیاں چٹخ رہی ہیں۔ کچھ کرنے کے حوصلے ٹھٹھر کر رہ گئے ہیں — میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اور کیوں ہو رہا ہے! زندگی کا یہ نقشہ، اُن تصورات سے کس قدر مختلف تھا جو کالج کے زمانے میں تابناک مستقبل کے پیامبر بنتے تھے۔

یہ تلخ تجربہ ناقابلِ برداشت تھا۔ میں نے اس کے خلاف شدت سے صدائے احتجاج بلند کی۔

میں نے اخبارات کو خطوط بھیجے۔ میں نے مقالات لکھے۔ میں نے دلائل و براہین سے معاشرہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس قسم کی ہلاکت آفریں فضاؤں کی پرورش سے زندگی کی کسقدر عظیم توانائیوں کو مفلوج بنا رہا ہے۔ لیکن کسی نے میری بات نہ سُنی۔ یہی نہیں کہ اسے ان سُنی کر دیا۔ بڑی دیدہ دلیری سے یہ کہکر دھتکار دیا گیا کہ تم اسی سلوک کی مستحق ہو۔ اس لئے کہ تم عورت ہو۔

میں تنہائیوں میں بیٹھ کر اپنے آپ سے پوچھتی کہ یہ ٹھیک ہے کہ میں عورت ہوں۔ لیکن کیا میں انسان نہیں ہوں؟ کیا فطرت نے مجھے بھی انسانوں کی طرح سوچنے والا دماغ اور دھڑکنے والا دل نہیں دیا؟ میں نے کیا جرم کیا ہے کہ مجھے مقام انسانیت سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ ایک لڑکی کی شکل میں جنم لینے میں میرے انتخاب کو تو کوئی دخل نہیں تھا۔ مجھ سے تو کسی نے پوچھا تک بھی نہیں تھا ــــ تو پھر

خدایا! جس خطا کی یہ سزا ہے، وہ خطا کیا ہے؟

میں ہر ایک سے پوچھتی کہ انسانیت کی دنیا میں، مرد اور عورت کے لئے یہ مختلف معیار اور مختلف پیمانے کیوں ہیں؟ لیکن میرے اس سوال کا جواب دینا تو کجا، کسی نے اسے سُننے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ اور جس نے اتفاق سے سن لیا اس نے اسے اس قابل ہی نہ سمجھا کہ اسے سمجھا ہی جائے۔

میں اکثر سوچتی کہ اگر مجھ سے کسی وقت کوئی غلطی ہو جائے تو اس کی تلافی کا ہر وقت امکان ہوتا ہے۔ اگر میں ایک سال محنت نہ کرنے کی وجہ سے امتحان میں ناکام ہو جاؤں تو دوسرے سال محنت کر کے اول نمبر پر آ سکتی ہوں۔ میں اپنی ہر کمی کو پورا کر سکتی ہوں۔ میں اپنی ہر حالت کو بدل سکتی ہوں۔ لیکن پیدائش کے اعتبار سے عورت ہونا، ایک ناقابلِ تغیر حادثہ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب آپ کسی ایسے حادثہ سے دوچار ہوں جس سے بچ جانا کسی صورت میں آپ کے بس میں نہ ہو، تو اس کا نتیجہ مایوسی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور مایوسی اور سرکشی تو (قرآن کے دیئے ہوئے تصورِ ابلیس کے مطابق) ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ مجھے زندگی سے نفرت پیدا ہو گئی۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت پیدا ہو گئی۔ میرا مزاج چڑچڑا ہو گیا۔ میں ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہونے لگی۔ میرے عزیز رشتہ دار۔ میرے دوست احباب، اس تبدیلی سے، پہلے متعجب ہوئے۔ پھر مشوش۔ اور اس کے بعد میری طرف سے مایوس۔ نہ میں انہیں سمجھا سکتی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ نہ وہ سمجھ سکتے تھے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔

اک معمہ تھا۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کی! اک خواب تھا دو لمحے کا

میرے عزیز بھائیو اور بہنو! ذرا سوچئے کہ یہ زندگی کس قدر جہنم کی زندگی تھی اور مجھ پر کتنی قیامتیں گذر رہی تھیں۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ میری قسمت نے کس طرح یاوری کی کہ انتہائی مایوسیوں کی ان گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں، قرآن میرے سامنے آگیا اور اس نے میری مایوسیوں کو تابندہ امیدوں میں بدل دیا۔ اس نے واضح الفاظ میں بتایا کہ خدا نے جسقدر صلاحیتیں انسان کو دی ہیں، عورت ان میں برابر کی شریک ہے اور شرف و حقوق انسانیت کے راستے میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں یہ پھاٹک لگا دیا گیا ہو "تم اس سے آگے نہیں جا سکتی"۔ دنیا میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ عورت کو ان حقوق سے محروم کر سکے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ مکافاتِ عمل کی میزان میں عورت اور مرد کے اعمال کے تولنے کا ایک ہی معیار اور ان کے مدارج متعین کرنے کا ایک ہی پیمانہ ہے۔ مرد، محض اس لئے کہ وہ مرد ہے، قانونِ خداوندی کی زد سے بچ نہیں سکتا۔

اس اعلانِ عظیم۔ اس نویدِ حیات نے میری زندگی کو ایک نیا خواب، اور اس خواب کو ایک نئی تعبیر عطا کر دی۔ اب زندہ رہنے کے لئے ایک مقصد اور آگے بڑھنے کے لئے ایک نشانِ راہ مل گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عورت سے اس کا یہ صحیح مقام کس نے چھینا ہے۔

یہ سب کچھ بتانے اور سمجھانے والے کون تھے! پرویز صاحب۔ ان کے متعلق میں اپنی بہنوں سے ایک ہی بات کہنا چاہتی ہوں۔ اور وہ یہ کہ اگر انسانیت کی عدالت میں عورت کو اپنے حقوق کی مدافعت کے لئے کسی وکیل کی ضرورت پڑی، تو اس کے لئے اس کی نگاہِ انتخاب، پرویز صاحب کے سوا کسی اور پر نہیں پڑ سکیگی۔ ایک قابلِ اعتماد وکیل۔ ایک سچا غم خوار۔

میری زندگی کی دوسری مشکل بھی اس سے کچھ کم اذیت دہ نہیں تھی۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد پاکستان — یعنی ہماری امیدوں کا واحد مرکز اور ہماری حفاظت کا قابلِ اعتماد قلعہ۔ ان شکاریوں کے ہاتھ میں آگیا جو نشۂ قوت میں بدمست۔ اخلاقِ انسانیت سے تہی داماں اور انتہائی درجہ کے نااہل تھے۔ یہ خود ساختہ لیڈر، زبان سے وہ کچھ کہتے جسے ان کا دل جھٹلاتا اور جو کچھ کہتے اسے کبھی کر کے نہ دکھاتے۔ انہوں نے اسلام کا لفظ طوطے کی طرح رٹ رکھا تھا جسے یہ اٹھتے بیٹھتے دھراتے رہتے تھے لیکن حرام جو انہیں پتہ ہو کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ یا انہیں کبھی اس قسم کا خیال تک بھی آیا ہو کہ جو کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اسے عملاً متشکل کرنا چاہئے۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے بڑوں کو

کبھی اس کا احساس اور اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کے ابھرنے والے نوجوان (جنہیں یہ ہمیشہ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش کہہ کر نگہِ حقارت سے ٹھکرا دیتے ہیں) کسقدر سادہ اور معصوم ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی، انصاف، دیانت اور عملِ پیہم کو بھانپنے اور پرکھنے کے لئے ان کی نگاہ کسقدر تیز ہوتی ہے۔ ایک چھوٹا سا بچہ بھی جب اپنے ماں باپ کے قول اور فعل میں تضاد دیکھتا ہے تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہی ہوں، میں اس وقت چھوٹی سی تھی، لیکن میں اپنے تمام نہاد لیڈروں کی کسی قسم کی بددیانتی اور بے ایمانی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ ان بڑوں کے قول اور عمل میں اسقدر تفاوت، کا منفی نتیجہ یہ تھا کہ میں ان کی طرف سے ہی نہیں، خود انسانوں کی طرف سے یکسر مایوس ہو گئی۔ مجھے کسی پر اعتماد ہی نہ رہا۔ میں کسی پر بھروسہ ہی نہیں کر سکتی تھی۔ میرا تجربہ مجھے بتاتا ہے کہ اگر کسی کی کیفیت یہ ہو جائے کہ وہ کسی پر بھروسہ ہی نہ کر سکے، تو اس کی زندگی جہنم کی ہو جاتی ہے۔ انسانوں کے اندر رہنا اور ان میں سے کسی کو قابلِ اعتماد نہ سمجھنا ــــ عذاب نہیں تو اور کیا ہے۔ ضمناً میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ موجودہ دور کے نوجوانوں کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ یہ کسی پر اعتماد ہی نہیں کر سکتے۔ اگر ہمارے بڑے چاہتے ہیں کہ ان نوجوانوں کو ہاتھ سے نہ کھو دیں تو اس کا ایک ہی علاج ہے۔ اور وہ یہ کہ اپنے کردار میں صداقت اور دیانت کا مظاہرہ کریں۔ نوجوانوں کے دل میں ان کا احترام پیدا ہو جائے گا۔

بہرحال، میں عدمِ اعتماد کے اس جہنم میں مبتلا تھی کہ خوش بختی سے میرے سامنے طلوعِ اسلام آگیا۔ اس نے مجھے میرا کھویا ہوا اعتماد واپس دلا دیا۔ اور زندگی کی نئی امیدیں اور تازہ ولولے بیدار کر دیئے۔ مجھے اس احساس اور یقین سے بڑا سکون اور اطمینان نصیب ہو گیا کہ اس بے اعتماد دنیا میں کم از کم ایک انسان تو ایسا ہے جس پر میں پورا پورا اعتماد کر سکتی ہوں۔ یہ قابلِ اعتماد انسان ہے ــ پرویز ــ کہ جو کچھ اس کی زبان پر ہوتا ہے وہی کچھ اس کے دل میں ہوتا ہے۔ اسے اپنے نظریات پر ناقابلِ شکست یقین ہے ــــ وہ یقین جو علم و بصیرت کا نتیجہ ہوتا ہے ــــ اور وہ اپنے محکم اصولوں کے معاملہ میں کسی سے کسی قیمت پر بھی مفاہمت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

مثلِ خورشید سحر فکر کی تابانی میں ــ بات میں سادہ و آزاد۔ معانی میں رفیق
اس کے اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا ــ اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

پرویز صاحب کے ہفتہ واری درس نے مجھے جینے کا ایک سہارا اور زندگی کا مقصد عطا کر دیا۔ برسوں تک میں، انسانی زندگی کے لیے مقصد اور کاروانِ انسانیت کے بے منزل ہونے کے واہمہ میں مبتلا تھی ــــ میں ہی نہیں۔ یہ تو ہمارے دور کا ایک عالمگیر مرض ہے جس میں چھوٹے

بڑے سب ماخوذ ہیں۔ لیکن میری مصیبت یہ تھی کہ میں اس کے باوجود زندگی اور اس کی حقیقتوں کی طرف سے غیر جانبدار بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ میں اپنے آپ سے راہ فرار اختیار نہیں کر سکتی تھی۔ میں جہاد زندگی میں تیشۂ فرہاد کی قائل تھی۔ میں کشمکش حیات کو زور دست و ضربت کاری کا مقام سمجھتی تھی۔ میں ——

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

کی قائل تھی۔ میں معاشرہ اور اس کی غلط اقدار میں بنیادی انقلاب لانا چاہتی تھی۔ لیکن میرا ذہن میرے ان انقلاب آفریں جذبات کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ میرے خیالات میں ابہام تھا۔ میرے سامنے راہ عمل واضح نہیں تھی۔ میں یکسر پیکر انقلاب تھی لیکن میں حق اور باطل میں خط امتیاز نہیں کھینچ سکتی تھی۔ گارڈن پاول کے الفاظ میں، میری آرزو یہ تھی کہ

بار الہا! جن چیزوں کا بدلنا میرے بس میں نہیں انہیں قبول کرنے کیلئے مجھے سکون قلب عطا کر۔
جن چیزوں کو میں بدل سکتا ہوں۔ انہیں بدلنے کی ہمت دے۔
اور اس کے ساتھ ایسی بصیرت عطا فرما جو حق و باطل میں تمیز کر سکے۔

مجھے معلوم نہیں کہ گارڈن پاول نے جو چاہا تھا اسے ملا یا نہیں۔ لیکن پرویز صاحب کے ہفتہ وار درسوں نے مجھے وہ فردوس یہ اماں سکون۔ وہ کوہ آسائش۔ اور وہ حقیقت کشا نگاہ عطا کر دی ہے جس کی دعا گارڈن پاول نے مانگی تھی۔ یہ قرآن کا عدیم النظیر انداز ہے کہ وہ نہایت مبہم معاملات اور پیچیدہ و خم مسائل حیات کو بڑی سادگی اور آسانی سے حل کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ تعمیری اور تخریبی عناصر کو چھان پھٹک کر الگ کر دیتا ہے۔ اور ثبات و تفریق میں نہایت واضح خط امتیاز کھینچ دیتا ہے۔ جب اس طرح انسانی فکر میں جلا اور نگاہوں میں بصیرت پیدا ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ وہ حیات آفریں کیف و انبساط ہوتا ہے جو حقیقی حریت فکر و نظر ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس سے انسان اپنے احساس کہتری اور ذلت احتیاج کو جھٹک کر رکھ دیتا ہے کیونکہ اسے اب انسانوں کے خود ساختہ اصنام کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہونا پڑتا۔ علاوہ ازیں، چونکہ قرآن انسانی اختیار و ارادہ کو عظیم ترین قدر قرار دیتا ہے اس لئے اس سے انسانی ذات میں عجیب تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً میں نے جب قرآن کی بتائی ہوئی اقدار کو اپنے لئے بطور نصب العین حیات تسلیم کیا ہے تو یہ اس لئے کہ میں ان اقدار کی عظمت اور بلندی کی علیٰ وجہ البصیرت، دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ قائل ہوئی ہوں۔ اس میں نہ کسی کے جبر کا کوئی دخل تھا۔ نہ خوف کا شائبہ۔

البتہ اس میں اتنا خوف کا پہلو ضرور تھا کہ اس سے مجھے "پرویزی" کہہ دیا جائے گا۔ اور یہ معلوم ہی ہے کہ پرویزی ہونا گویا ملک (بلکہ پورے عالم اسلام) کی مفاد پرست قوتوں کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف ہے۔ لیکن یہ وہ خوف تھا جس نے مجھے دنیا کے ہر خطرہ سے بے باک کر دیا۔ قرآن کی اندار پر اس انداز سے ایمان اور یقین نے مجھے وہ اعتمادِ ذات اور عزتِ نفس عطا کر دی جس سے میں اس سے پہلے کبھی کیف اندوز نہ تھی۔ اب، محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کے الفاظ میں، کیفیت یہ ہو گئی ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے لوگ "بونے" دکھائی دیتے ہیں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اس موضوع پر اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

لیکن اس ناقابلِ لغزش اعتماد کے ساتھ، قرآن نے میرے سامنے علم و تحقیق کی اس قدر نئی راہیں کھول دی ہیں کہ اب محسوس ہوتا ہے کہ

جانا تو یہ جانا۔ کہ نہ جانا کچھ بھی۔

علم کے ان جدید آفاق کی وسعتوں کو دیکھ کر اپنی ہیچ مدانی کا احساس، قرآن کی بارگاہ میں بے ساختہ سرِ نیاز جھکا دیتا ہے اور انسان کے دل میں وہ عجز پیدا کر دیتا ہے جو "ربی زدنی علما" کی حسین دعا بنکر لب پر آجاتا ہے۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ اس ایک زندگی کی حقیقت کیا ہے، اگر اس طرح سو بار بھی دنیا میں آنا ہو تو "علم کے سمندر کے کنارے، بچوں کی طرح، سیپ اور گھونگھوں کے ساتھ کھیلنے کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکو گی"۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ میں نے قرآن کی بارگاہ سے جو کچھ پایا ہے اس کا حد و شمار نہیں ہو سکتا لیکن جو کچھ میں نے کہا ہے اس میں صرف ایک اور چیز کا اضافہ کرنا چاہتی ہوں۔ اور بس۔ آپ کسی زاویۂ نگاہ سے دیکھیں، آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم ایک ایسے ہجوم کے افراد ہیں جن میں سے ہر فرد، ہجوم کے ساتھ ہونے کے باوجود اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ کوئی بھی نہیں جسے ہم اپنا کہہ سکیں۔ ہم ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ پرکاہ کی طرح ادھر سے ادھر اڑتے رہتے ہیں۔ ہماری نہ کوئی منزل ہے۔ نہ مقام ہمارا اپنا تشخص ہی کچھ نہیں۔ انسانوں کی اس بھری دنیا میں، کوئی ایسا نہیں جس سے ہم اپنے دل کی بات کہہ سکیں۔ کوئی ایسا نہیں جو ہمارے جذبات میں ہمارا شریک ہو سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ معاشرہ ایک وسیع جیل خانہ ہے جس میں ہر قیدی، قیدِ تنہائی کاٹنے کے لئے الگ الگ کالی کوٹھڑی میں بند ہے۔

نہ کسی کے پاس دوسرے سے کہنے کے لئے کوئی بات ہے۔ نہ کسی کو دوسرے کی سننے کی تاب یا ضرورت۔ میں بھی اسی معاشرہ کا ایک فرد تھی ـــــ اپنے خیالات کی کال کوٹھڑی میں محبوس۔ اپنی کیفیات کی زنداں میں مقید۔ میں ملتے جب بھی اپنے دل کی بات دوسروں سے کہنا چاہی میں نے محسوس کیا کہ میں گویا کسی اور کرّے سے زمین پر اتر آئی ہوں۔ جہاں کے رہنے والے میری بولی ہی نہیں سمجھتے۔ میں کبھی انہیں دیوانہ سمجھتی۔ اور کبھی یہ کہ نہیں، یہ اتنے سارے لوگ سب کے سب دیوانے کیسے ہو سکتے ہیں۔ شاید میں ہی پاگل ہوں۔

اس قید تنہائی سے نکالنے کے لئے بھی قرآن ہی کا ہاتھ آگے بڑھا۔ اس نے مجھ سے میرا تعارف کرایا۔ میرا مقام متعین کیا۔ مجھے ایک وطن دیا۔ ایک گھر دیا۔ باتیں کرنے کو ہم زبان دئے۔ اب میں بے گھر۔ بے در۔ خانہ بدوش۔ صحرانشین نہیں۔ اب میں دنیا میں کہیں بھی ہوں، میرا گھر ـــــ طلوع اسلام میرے ساتھ ہوتا ہے۔ اب میں تنہا نہیں ہوں۔

عزیز بہنو اور بھائیو! خدا کے لئے، سچ سچ کہئے کہ اس کے بعد انسان کو اور چاہیئے کیا۔ پروین صاحب کے دئے ہوئے الفاظ میں،

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

یہ تمام انعامات اتنے بے بہا ہیں کہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ انسان ان کا شکریہ کس طرح ادا کرے۔ لیکن قرآن تو کسی سے "شکریہ" کا بھی متمنی نہیں ـــــ اور نہ ہی وہ شکریہ کا متمنی ہے جس نے ہمیں اس قرآن سے اس طرح متعارف کرایا ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ جو لوگ ابھی تک زندگی کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں، انہیں روشنی میں لانے کے لئے ان کی مدد کریں اور اس کے معاوضہ میں ان سے شکریہ تک کے متمنی نہ ہوں۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کے یہی معنی ہیں۔

(طلوع اسلام)

میں نے اس درس سے کیا حاصل کیا

(ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب)

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

اللہ تعالےٰ نے حضور نبی اکرمؐ سے مخاطب ہو کر کہا۔ کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴/۱)۔ اس کتاب کو ہم نے اس لئے نازل کیا ہے کہ تو بنی نوع انسان کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے۔ حضورؐ نے قرآن کی تعلیم کا چراغ روشن کیا۔ انسانوں کی عقل و فکر کی صلاحیتوں کو جلا دی۔ انہیں بصیرت عطا فرمائی۔ چنانچہ کائنات کے اندر اللہ کے دیے ہوئے نشان راہ یکے بعد دیگرے نظر آنے شروع ہو گئے۔ انسانیت اپنی منزل پہ پہنچنے کے لئے سیدھی اور متوازن راہ پر گامزن ہو گئی لیکن حضورؐ کی وفات کے بعد تاریخ نے پھر اپنے آپ کو دہرانا شروع کیا جس طرح سابقہ انبیائے کرامؑ کی تعلیمات حوادث کا شکار ہوئیں اسی طرح قرآنی تعلیم پر مختلف سمتوں سے یورشیں شروع ہو گئیں۔ قرآن کی تعلیم کو نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لئے مختلف تدبیریں سوچی گئیں اور ہر ممکن سازش بروئے کار لائی گئی۔ حق و باطل کی آویزش جاری رہی۔ لیکن چونکہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے اس لئے باطل کی قوتیں جہاں سابقہ انبیائے کرامؑ کی تعلیم کو ناپید کرنے میں کامیاب ہوئیں وہاں قرآن کی تعلیم پہ پردے تو ڈالے گئے لیکن اسے مٹانا ان کے بس کی بات نہ تھی فضائے قرآنی پہ بادل آتے بھی رہے اور چھٹتے بھی رہے۔ ایک طرف قرآن کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں دوسری طرف

علم و بصیرت سے بہرہ ور انسان ان سازشوں کو بے نقاب کرتے رہے جن ارباب علم نے قرآن کی تعلیم کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا ان کا نہ صرف دنیائے اسلام میں بلکہ عالم انسانیت میں ایک خاص مقام ہے اس لئے کہ وہ انسانیت کے محسن ہیں۔ اور میں آج بلا خوف تردید کر سکتا ہوں کہ فی زمانہ نبی اکرمؐ کا جھنڈا بلند کرنے میں محترم پرویز صاحب کا ہاتھ سب سے زیادہ مضبوط اور سب سے زیادہ بلند ہے۔ محترم پرویز صاحب نے (اللہ تعالےٰ انہیں جزائے خیر دے) قرآنی تعلیم پر جتنے پردے تھے ان کو ایک ایک کر کے چاک کیا۔ قرآن کے خلاف جتنی سازشیں تھیں انکو ایک ایک کر کے بے نقاب کیا۔ اس میں شک نہیں کہ جہالت میں گھرا ہوا انسان حق و صداقت کو قبول کرنے میں بڑا سست رو واقع ہوا ہے۔ لیکن ایک معلم اور ہادی کا کام علم کو دوسروں تک پہنچانا ہے۔ کسی کے حلق میں ٹھونسنا نہیں۔ حق ہمیشہ آگے بڑھتا رہے گا اور باطل ہمیشہ مٹتا رہے گا۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ گذشتہ پانچ سال کے عرصے میں محترم پرویز صاحب نے جو قرآنی حقائق بیان کئے ہیں انہیں ایک نشست میں بیان کرنا تو درکنار ان کی فہرست بھی پیش کر سکوں۔ لیکن مثال کے طور پر چند ایک اہم مسائل پر جنہیں پرویز صاحب اپنے درس میں اکثر دہراتے رہتے ہیں اس موقع پر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ یہ نکات دوسرے دینی لٹریچر میں کمیاب ہیں اور ان کے لئے ہم صرف محترم پرویز صاحب کی بصیرت افروز کے مرہون منت ہیں اور اگر کہیں دوسری جگہ ملتے بھی ہیں تو ان میں نہ وہ ربط ہوتا ہے نہ حسن جو محترم پرویز صاحب نے پیدا کیا ہے۔

(۱) خدا کا تصور جب سے انسان میں تمدنی شعور بیدار ہوا خدا کی طرف سے بوساطت انبیائے عظام کرام وحی آتی رہی۔ وحی کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ خدا کے متعلق صحیح تصور تھا۔ جب علم وحی کا سرچشمہ ایک خدا تھا تو شروع سے آخر تک خدا کا تصور بھی ایک ہی تھا لیکن ہر زمانے میں محسوسات کا خوگر انسان اس صاف و شفاف تصور میں اپنی ذہنی رنگ آمیزی کرتا رہا۔ آج چونکہ کوئی دوسری آسمانی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں اس لئے خدا کا تصور جو قرآن نے دیا ہے وہی صحیح تصور ہے۔ از روئے قرآن جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے اس کی کنہ و حقیقت اور ماہیت اور کیفیت کا سمجھنا انسانی ذہن کے بس کی بات نہیں — ایک Infinite چیز ایک Finite کے احاطہ ادراک میں نہیں آسکتی۔ قرآن نے صفات خداوندی کا ذکر کیا ہے۔ اور انہی کی رو سے خدا کا تصور سامنے آتا ہے۔ قرآن نے پہلے انسان کا تصور دیا کہ وہ کیا چیز ہے۔ قرآن کے نزدیک خدا کو اس وقت تک

نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ انسان کو نہ سمجھا جائے۔ انسان کے اندر اس کی طبعی زندگی اور اس کی ذات دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جس طرح انسان کی طبعی زندگی کے لئے قوانین مقرر ہیں اسی طرح انسانی ذات کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر ہیں۔ صفات خداوندی انسانی ذات کے اندر Un-developed form میں موجود ہیں۔ انسان بہ طیب خاطر اپنے اوپر کچھ پابندیاں عاید کرتا ہے تو انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور صفاتِ خداوندی بہ حدِ بشریت انسان کے اندر منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ خدا کی صفات کو اپنے سامنے بطور معیار رکھ لینا اور اپنی ذات میں ان کی نمود کو نصب العین قرار دینا ایمان باللہ کہلاتا ہے۔ چنانچہ خدا اور انسان ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ خدا رفیق اعلیٰ ہے اور انسان رفیق ادنیٰ ہے۔ لیکن انسانی ذات کی نشوونما انفرادی طور پر نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف جماعت کے اندر رہ کر قرآنی معاشرے کے قیام کے بعد ہو سکتی ہے لہٰذا جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہوگا جن کی ذات نشوونما یافتہ ہو اس میں صفاتِ خداوندی کا ظہور از خود ہوتا چلا جائے گا۔ خاص حالات میں خدا کی ایک صفت کا ظہور ہوتا ہے جو قانونِ خداوندی کہلاتی ہے اور چونکہ خدا کی صفات غیر متبدل ہیں اسلئے قوانین خداوندی بھی غیر متبدل ہیں (وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۲)۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (۱۰/۶۴)) مطالعۂ فطرت اور مشاہدہ کائنات لقائے رب یعنی خدا کے آمنے سامنے ہونے کا ذریعہ ہے۔ اسی سے قانونِ مکافاتِ عمل کی رمز سمجھ میں آتی ہے۔ جو لقائے رب کی دوسری توجیہ ہے۔

(۲) نجات

محترم پرویز صاحب نے از روئے قرآن نجات کے مروّجہ تصور کو باطل قرار دیا۔ دنیا کے دیگر مذاہب جو نجات کا تصور دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان جیسا پہلے تھا ویسا ہو جائے۔ اور یہ کہ کائنات کی ہر حرکت Cyclic order میں ہے اس میں Progress نہیں۔ قرآن نے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کہہ کر افلاطون کے طلسم کی دھجیاں بکھیر دیں۔ صراطِ مستقیم پر چلنا خدا کی صفات میں سے ایک ہے اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۱۱/۵۶) چونکہ انسان خدا کا رفیقِ ادنیٰ ہے اس لحاظ سے انسانی ذات کے اندر بھی یہ صفت موجود ہے۔ اللہ ذی المعارج ہے۔ اس بنا پر انسان کو سیدھا راستہ چلنے یعنی آگے کی طرف بڑھنے کے ساتھ ساتھ بلندی کی طرف بھی جانا مقصود ہے۔

(۳) جزا اور سزا

سزا انتقامی ہوتی ہے یا تادیبی۔ لیکن خدا اس سے بلند ہے اس کی سزا نہ انتقامی ہے نہ تادیبی۔ انسانی اعمال کا فطری نتیجہ جزا اور سزا ہے۔ انسان

کے اعمال میں جنت اور جہنم چھپی ہے۔

(۴) حسنات اور سیئات جس طرح کائنات کی دوسری اشیاء میں Anabolic اور Catabolic Processes موجود ہیں یعنی ایک شے تبدریج بنتی بھی رہتی ہے اور تحلیل بھی ہوتی رہتی ہے اسی طرح انسان کے وہ اعمال جن سے انسانی ذات کے Making up process کو تقویت ملے حسنات ہیں اور جن سے Breaking up process کو مدد ملے وہ سیئات ہیں۔ اور Making up processes کا حاصل ثواب کہلاتا ہے۔

(۵) قانون مکافات عمل یہ دنیا Cause and effect کی دنیا ہے، انسان کا ہر چھوٹے سے چھوٹا عمل نتیجہ پیدا کرکے رہتا ہے۔ ہر اچھے کام سے انسانی ذات کی تعمیر ہوتی ہے اور ہر برے کام سے اس کی تحلیل ہوتی ہے۔ از روئے قرآن یہ ساری کائنات 'یہ سارا کارگاہ عالم' اس لئے وجود میں لایا گیا ہے کہ کوئی مجرم سزا پائے بغیر نہ رہ سکے۔ اور کوئی اچھا کام کرنے والا اس کا نتیجہ دیکھے بغیر نہ رہ سکے (۵۳/۳۱)۔ اور زندگی کا کنٹرول خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ خبیر اور بصیر ہے۔ اس سے کوئی شے اور کوئی عمل پوشیدہ نہیں۔ اللہ انسان کی شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ انسان کے ہر عمل کے ساتھ پاسبان لگا رہتا ہے اور ہر شخص کا طائر عمل اس کی گردن کے ساتھ لٹکا ہوا ہے اور یہ خود اس کی اپنی ذات ہے۔ ظہور نتائج کے دن یہی کتاب کھلا ہوا صحیفہ بن کے سامنے آجائے گی۔ اور کہا جائے گا کہ پڑھ اس کتاب کو جو تیری گردن میں لٹکی ہوئی ہے اور اڑ جانے والے پرندے کی طرح تیرے کنٹرول میں بھی نہیں ہے۔ چنانچہ انسانی عقل جرم کی Justification میں چاہے کتنے ہی پر دے ڈالے۔ انسانی ذات خود ان کے خلاف گواہی دیگی۔

(۶) تقدیر عام عقیدہ کہ ہر شے قسمت میں لکھی ہے غلط ہے۔ یہ غیر قرآنی تصور Pre-Islamic ایران سے آیا اور مسلمانوں کا جزو ایمان بن گیا۔ قرآن نے جو تصور دیا وہ یہ ہے کہ Origin ابتدا اور Creation تخلیق دو الگ الگ شے ہیں۔

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو Originate کیا یعنی کائنات کی ابتدا عالم امر سے ہوئی یہاں خدا کا امر مطلق ہے اس پر کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا، دوسرا یہ کہ خدا کا امر پیمانوں میں گھرا ہے۔

ان پیمانوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ کائنات کی ہر شے ان پیمانوں میں جکڑ کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہے۔ تیسرے یہ کہ انسان بھی کائنات کا ایک حصہ ہے جس طرح انسان کے جسم کے لئے طبعی قوانین موجود ہیں۔ اسی طرح اس کی ذات کے لئے Ethical Laws ہیں۔ یہ کہ انسان کسی کام کے کرنے میں مجبور نہیں۔ اسے اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ انسان سے کہا گیا ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۴۱/۴۰) عمل کرو تم جیسا جی چاہے۔ لیکن ہمارا قانون مکافاتِ عمل اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ جو اعمال کے نتائج مقرر ہو چکے ہیں ان میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

(۷) وحی

کائنات میں ہر شے کو براہ راست وحی کی راہ نمائی ملتی ہے۔ لیکن یہ رہنمائی انسان کے اندر نہیں رکھی گئی۔ انسانوں کی دنیا میں وحی نبی کو ملتی ہے جو اسے دوسرے انسانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ وحی کے ذریعے نبی Realities کو Discover نہیں کرتا۔ بلکہ اس پر انکا انکشاف ہوتا ہے۔ نبی پر وحی نازل ہوتی ہے۔ جس کو وحی ملتی ہے وحی ملنے سے پہلے اللہ اس کی تربیت کرتا ہے لیکن صاحب وحی کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ یہ اسے ملنے والی ہے۔ وحی نبی کے تخیلات اور تصورات۔ جذبات اور میلانات کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ یہ ایک خارجی حقیقت ہے جو اس پر منکشف ہوتی ہے۔ محترم پرویز صاحب نے وحی کے من جانب اللہ ہونے اور انسانی فیصلوں کا انسانی عقل و فہم کی رو سے ہونے کے خط امتیاز کو واضح کیا اور بتایا کہ قرآن نے نبی اکرمؐ کی زبان سے یہ کہلوا کر کہ قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰى نَفْسِىْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِىْٓ اِلَىَّ رَبِّىْ (۳۴/۵۰) ان سے کہو کہ اگر میں غلطی کرتا ہوں تو یہ میری طرف سے ہے اور اگر میں صحیح راستہ پر ہوں تو یہ اللہ کی طرف سے راہنمائی ہے، ان دونوں میں تمیز کر دی ہے۔ وحی میں Compromise نہیں ہوسکتا۔ جس طرح خارجی کائنات میں طبعی قوانین میں ذرہ بھر تبدیلی کرنے سے سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حق میں ذرہ بھر مفاہمت کرنے سے سارا نظام بگڑ جاتا ہے۔ عقل حقیقت کو معلوم کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میں نے اسے پالیا ہے۔ عقل کا طریق تجرباتی ہے۔ ایک چیز جسے آج عقل صحیح سمجھتی ہے وہ بالکل غلط ہوسکتی ہے۔ اس ہمہ قرآن عقل کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وحی کو قبول کرنے کا ذریعہ عقل ہے۔ وحی کی کوئی چیز خلاف عقل نہیں ہوسکتی۔ البتہ وحی آتی اس مقام سے ہے، جو عقل سے ماورا ہے۔ لیکن عقل کے ذریعے اسے پہچانا جاسکتا ہے چنانچہ ان گوشوں کو واضح کر کے کہ وحی عقل کی پیدا کردہ نہیں اور یہ کہ عقل کا بڑا درجہ ہے اور یہ کہ وحی کے حقائق عقل کی رُو سے سمجھ میں آتے ہیں، قرآن مذہب کی دنیا میں ایک بہت بڑا انقلاب لے آیا۔

مذہب کی دنیا میں وحی اور عقل کے دو الگ الگ دائرے سمجھے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایمان لانے کے لئے عقل کی ضرورت نہیں۔ یہ وجدانی شے ہے۔ یونان سے اس تخیل کی ابتدا ہوئی۔ ہندوستان میں اس تخیل نے ویدانت کی شکل اختیار کی۔ اور مسلمانوں کے اندر یہ تصوف کی شکل میں گھس آیا۔ مذہب کی دنیا میں دماغ کو ماؤف کر کے بات منوائی جاتی ہے۔ قرآن ہر بات کو عقل کی رُو سے منواتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ عقل سے کام لینا چھوڑ دو گے تو تمہارے دماغ کی (Disuse Atrophs ہو جائے گی۔ اور اسی کو دلوں اور کانوں پر مہر لگنے کے نام سے پکارا گیا ہے اللہ تعالےٰ وحی کو منوانے کا طریق یہ بتاتا ہے کہ (۱) ہم نے اپنی نشانیاں عالم النفس و عالم آفاق میں بکھیر دی ہیں تم کائنات پر غور کرتے جاؤ تا آنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ (۲) پھر کہتا ہے کہ سابقہ اقوام عالم کی سرگذشت پر نظر دوڑاؤ تاکہ تاریخی واقعات سے تمہیں وحی کی صداقت پر یقین آجائے (۳) پھر کہتا ہے کہ ان دیکھے نتائج پر ایمان لاؤ اور وحی کی ہدایت پر عمل کرو نتائج خود بتا دیں گے کہ وحی کی رہنمائی درست تھی۔

عقل اور جذبات کا باہمی تعلق

جذبات مذموم چیز نہیں۔ جذبات کو دبایا نہیں جا سکتا۔ جذبات کو دبانے سے Perversion پیدا ہوتی ہے جذبات کی بے راہ روی تباہ کن ہے اس لئے جذبات کو عقل کے تابع رکھنا ضروری ہے (اور عقل کو وحی کے تابع) اگر عقل جذبات کی لونڈی بن جائے تو فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ مومنین کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی بیان کرتا ہے کہ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ ۔ (۳/۱۳۴) یعنی وہ غصے کو Adjust کر لیتے ہیں۔ اللہ نے ہر چیز بالحق پیدا کی ہے۔ کوئی چیز فی ذاتہ شر نہیں لیکن کسی قوت کا غلط استعمال اسے شر بنا دیتا ہے۔ وحی عقل کو پختگی دیتی ہے۔ جذبات کی لونڈی بننے سے روکتی ہے اور مطلق اور ابدی اقدار دے کر عقل کا راستہ متعین کرتی ہے۔ وحی، عقل اور جذبات کو اپنے اپنے مقام پر رکھا جائے تو سب بالحق ہیں۔ لیکن اگر ان کے مقام کو بدل دیا جائے تو شر پیدا ہو جاتا ہے۔

(۸) ربوبیت

کائنات کی ہر شے کی Development میں ایک نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ اور ایک مقام تکمیل۔ ہر شے اپنے نقطۂ آغاز سے نکتۂ تکمیل تک ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی بتدریج ایک فارمولا کے تحت آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس Ppocess of development کو ربوبیت کہتے ہیں۔ ایک بیج کے اندر صلاحیت ہوتی ہے کہ درخت بن جائے

لیکن وہ اپنے آپ درخت نہیں بنتا۔ دوسرے عناصر مٹی، ہوا، پانی، روشنی وغیرہ اسکو اوپر اٹھاتے ہیں۔ جس بیج کو یہ سارے عناصر صحیح تناسب میں میسر ہوں اس کی مضمر صلاحیتیں بروئے کار آجاتی ہیں۔ اور وہ اپنی انتہائی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر یہ عناصر میسر نہ ہوں تو بیج کی صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں۔ ہر شئے نشوونما پاکر وہاں تک پہنچ جاتی ہے جہاں تک اس کا پہنچنا مقصود ہے (لِاَجَلٍ مُّسَمًّی) جس حد تک کوئی شئے جا سکتی ہے اس کو اس کی تقدیر کہتے ہیں۔ بیج سے درخت اور درخت سے بیج یہ ایک Cyclic order میں چلتا رہتا ہے یہی حال حیوانی زندگی کا ہے۔ لیکن انسان کے متعلق قرآن نے کہا کہ وہ صراط مستقیم پر چلتا ہے۔ اور اس کا بلندی کی طرف جانا مقصود ہے یہ اس لئے کہ انسان صرف جسم تک محدود نہیں۔ جسم کے علاوہ اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے ذات کہتے ہیں اور جسے قرآن نفس کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ انسان کا جسم موت کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے لیکن نفس انسانی اسکے بعد بھی باقی رہتا ہے ذات کوئی بنی بنائی چیز نہیں ہوتی ذات کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ اور امکانی شکل میں ہوتی ہیں۔ ان کو نشوونما دے کر Actualise کرتے جانے کا نام استحکام ذات ہے۔ ذات ذات کہلوانے کی مستحق اس وقت ہوتی ہے جب اسکی نشوونما ہو جائے چاہے ایک حد تک ہی ہو۔ انسانی جسم کی نشوونما طبعی قوانین کے تحت ہوتی ہے اور ذات کی نشوونما ان قوانین کے تحت ہوتی ہے جنہیں مستقل اقدار کہتے ہیں۔ اس کا طریق یہ ہے کہ دوسروں کی نشوونما کرتے جاؤ اس سے خود آپ کی نشوونما ہوتی جائے گی جسم کی نشوونما لینے میں ہے اور ذات کی نشوونما دینے میں۔ اپنی جدوجہد کے ماحصل کو دوسروں کے لئے چھوڑ دینا اس سے دوسروں کی پرورش ہوتی ہے اور بلاواسطہ اپنی پرورش ہوتی ہے۔ ایک شخص اپنی جدوجہد کے ماحصل کو صرف اپنے لئے وقف کر دیتا ہے اور دوسرا اس کو دیگر انسانوں کے لئے کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں جدوجہد اتنی رہے گی۔ ماحصل بھی اتنا رہیگا۔ لیکن پہلی صورت میں نتیجہ جہنم ہوگا اور دوسری صورت میں صرف نگاہ کے بدلنے سے نتیجہ جنت میں تبدیل ہو جائے گا۔

(۹) دین اس نظام زندگی کا نام ہے جس میں انسان مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جہاں پر انسان کے لئے اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے مواقع میسر ہوتے ہیں اس نظام کی بنیاد عدل اور احسان پر ہوتی ہے۔ عدل یہ کہ ہر انسان کے لئے یکساں مواقع میسر ہوں۔ احسان یہ کہ جہاں ایک فرد میں کمی رہ جائے اس کمی کو دوسرے افراد معاشرہ پوری کر کے معاشرہ میں حسن پیدا کریں۔ اسلام دین ہے مذہب نہیں۔ قرآن پرستش کا تصور نہیں دیتا۔ دین میں عبادت

اور دنیا کے کام آپس میں یکجا ہوتے ہیں۔ قرآن ایک معاشرے کی بنیاد ڈالتا ہے اور اس کی ابتداء ایک معاہدے سے ہوتی ہے وہ معاہدہ یہ ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (۹/۱۱۱)۔ اس معاہدے کی رُو سے ہر فرد معاشرہ کی جان اور مال اللہ کے لئے ہوتے ہیں اور اس کے بدلے میں اللہ جنتی زندگی عطا کرتا ہے۔ ایسی زندگی جس میں ضروریات زندگی یا فراغت میسر ہوں۔ نہ وہاں خوف ہو نہ حزن۔ اس معاہدے کو اللہ براہِ راست نہیں بلکہ ان افراد معاشرہ کے ذریعے پورا کرتا ہے جو اللہ کی مقرر کردہ مستقل اقدار کے نفاذ کے ذمہ دار ہوں۔

(۱۰) صلوٰۃ۔ وزکوٰۃ صلوٰۃ ایک پورے نظام زندگی کا نام ہے۔ صفات خداوندی کو بطور معیار اپنے سامنے رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے چلنا۔ یا کتاب اللہ کے ساتھ پوری پوری وابستگی سے اپنے اندر علی حد بشریت صفات خداوندی کا منعکس کرتے جانا صلوٰۃ ہے فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی (۷۵/۳۱) یہاں صلّٰی کے مقابلے میں لفظ تولّٰی آیا ہے جو نہج زندگی قرآن نے مقرر کیا ہے مسلسل اس کے پیچھے چلنا اسے Closely follow کرنا۔ صلّٰی ہے اور اس سے گریز کی راہیں نکالنا تولّٰی ہے۔ قرآن کریم پرندوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اپنی صلوٰۃ سے واقف ہیں یعنی جو نظام زندگی ان کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس سے باخبر ہیں۔ اجتماع صلوٰۃ' نظام صلوٰۃ کا بنیادی اور اہم حصہ ہے۔ انسانوں میں نظام صلوٰۃ قائم اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ پوری انسانیت کی نشوونما ہوتی جائے یہی زکوٰۃ ہے۔

(۱۱) قرآن کا معاشی نظام قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ پوری انسانیت کی نشوونما یکساں طور پر ہوتی جائے اس کے لئے جسمانی نشوونما کے ایسے اصول وضع کئے گئے جن کے ذریعے جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ ذات کی نشوونما بھی ہوتی جائے بلکہ جسمانی نشوونما ذات کی نشوونما کا ذریعہ بنے۔ اس کے لئے اصول یہ وضع کیا گیا کہ دولت معاشرے میں گردش کرتی رہے جس طرح خون جسم کے آخری Cell تک پہنچ کر اسے غذائیت پہنچاتا ہے اسی طرح دولت ہر فرد معاشرہ تک پہنچ کر اس کی نشوونما کا ذریعہ بنے۔ جس طرح خون کا جسم کے کسی عضو میں رک جانا بلاواسطہ اس عضو کے لئے اور بالواسطہ سارے جسم کے لئے مہلک ہے اسی طرح دولت کا چند افراد کے پاس رک جانا اور دیگر افراد معاشرہ کا اس سے محروم رہ جانا افراد اور معاشرہ دونوں کے لئے تباہ کن ہے۔ (۵۹/۷)۔ (۱) چنانچہ پورے معاشرے کی نشوونما کے

لیے ہر شخص زندگی کی تگ و دو اور اللہ کے فضل کی تلاش میں لگا رہے۔ (۶۲/۱۰) (ب) صرف حلال روزی کمائے (۲/۱۶۸) (ج) ہر شخص اپنی جدوجہد کے ماحصل کو اپنی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے بعد دیگر ضرورت مندوں تک پہنچاتا جائے (۲/۲۱۹) (د) جب تک معاشرے میں کوئی دوسرا فرد ضروریات سے محروم ہے اپنی دولت کو سمیٹ کر نہ رکھا جائے (۱۰۴/۱-۳) اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی سے زائد دولت کو اس نظام کے سپرد کر دیا جائے جس کے ذمے قانونِ خداوندی کا نفاذ اور افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا ہے (ش) زمین کی پیداوار میں کاشت کرنے والے کا حصہ اتنا ہے جس قدر اس نے محنت کی ہے کاشتکار زمین میں ہل چلاتا ہے۔ دانہ بوتا ہے اسلئے پیداوار میں شریک ہے مگر پانی کو سمندر سے اٹھانا بادلوں سے مینہ برسانا اور کھیتی کو سیراب کرنا کسان کے بوئے ہوئے بیج کو پودے کی شکل میں لانا اور فصل کو پکانا یہ سارا کام خدا کے نظامِ ربوبیت کے ذمے ہے اسلئے کاشتکار پیداوار سے اتنا حصہ لیکر جو اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے کافی ہو باقی اس نظام کے سپرد کر دے جس کے ذمے قانونِ خداوندی کا نفاذ اور افرادِ معاشرہ کی نشوونما ہے (ص) ایک شہری بچے کی صلاحیتوں کو نشوونما دینے میں جو عناصر کام کرتے ہیں ان میں اس کی ذہانت ہے جو اسے بلا مزد و معاوضہ ملی ہے اگر وہ مثلاً Imbecile یا Idiot پیدا ہو جاتا تو اس ذہانت کو حاصل کرنا اس کے اپنے بس میں نہ تھا۔ دوسرے عناصر سکول و کالج وغیرہ ہیں یہ سب معاشرے نے بنائے ہیں اسکے علاوہ اگر وہ حصولِ علم کے لئے دیگر ممالک کا سفر کرتا ہے تو یہ بھی معاشرے کا انتظام ہے۔ اس کی صرف اپنی محنت ہے۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی میں جو کچھ کماتا ہے اس میں اس کا حصہ صرف اسی قدر ہے جس قدر کہ وہ محنت کرتا ہے یا جس سے اس کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی ہیں۔ باقی جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اللہ کی امانت ہے اور اسے اس نظام کی طرف لوٹانا ضروری ہے جس کے ذمے اللہ کے قانون کے مطابق دیگر افرادِ معاشرہ کی صلاحیتوں کو نشوونما دینا ہے۔

(۲۶) اسلام کا نظامِ حکومت

اسلام مذہب نہیں دین ہے۔ یہ کوئی انفرادی شے نہیں۔ اجتماعی چیز ہے یہ ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ اسی ضابطۂ حیات کے مطابق اجتماعی زندگی کے نظام کو اسلامی مملکت کہتے ہیں اور اس نظام کو چلانے والی مشینری کو حکومت کہتے ہیں۔ قرآن نے زندگی کے جن شعبوں میں انقلاب پیدا کیا ان میں بنیادی گوشہ یہ تھا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے اللہ نے ہر انسان کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ ایک شخص ایک ضابطۂ حیات

بھی اپنے پاس کیوں نہ رکھتا ہو۔ یا خواہ قوانین سازی کے اختیارات ہی اسے کیوں نہ دے دیئے جائیں اور خواہ وہ کتنی بڑی Executive power ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔ اور خواہ اس کو نبوت ہی کیوں نہ مل چکی ہو۔ اسے حق حاصل نہیں کہ دوسروں سے کہے کہ میرے حکم کے پابند ہو جاؤ (۳/۷۹)۔ اس حقیقت کو قرآن بار بار دہراتا ہے اس لئے کہ یہ انسانوں کی دنیا میں بہت بڑے انقلاب کا آغاز تھا۔ خدا اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا (۱۸/۲۶) روزمرہ کی زندگی میں احکام خداوندی کی اطاعت ہی عبادت ہے۔

(ب) اس کی دوسری کڑی یہ ہے کہ خدا تو غیر مرئی ہے۔ سو جب حاکم سامنے موجود نہ ہو تو حکومت کس کی؟ اس محکومیت کی محسوس شکل یہ ہوگی کہ خدا نے اپنے قوانین و احکام کو وحی کے ذریعے انسانوں کو دے دیا اب خدا کی محکومیت کے معنی خدا کی کتاب کی محکومیت ہے۔ (۶/۱۱۵)۔ خدا کی کتاب کہتی ہے کہ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے اس کی اطاعت کرو اس کے علاوہ کسی حاکم کی کسی سرپرست کی اطاعت نہ کرو۔ (۷/۳) اور کفر اور ایمان کا فرق بتاتے ہوئے کہا ہے کہ مومن وہ ہیں جو اپنے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرتے ہیں اور کافر وہ ہیں جو اپنے فیصلے اس کتاب کے مطابق نہیں کرتے۔ (۵/۴۴)

(ج) تیسری کڑی۔ اگر اسلام مذہب ہوتا تو اس کے بعد بھی گنجائش تھی کہ ہر شخص قرآن پر اپنی سمجھ کے مطابق عمل کرتا۔ لیکن دین کا تقاضا یہ ہے کہ کتاب پر عمل اجتماعی شکل میں ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی زندہ شخصیت موجود ہو جو معاملات کے فیصلے دینے میں آخری authority ہو۔ اس کے لئے اللہ نے کہا کہ رسول کا مقصد صرف اسی قدر نہیں کہ وحی تم تک پہنچا دے بلکہ رسول اجتماعی نظام میں نظام کا مرکز بنتا ہے چنانچہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ یعنی یہ اس کی اطاعت نہیں اس لئے رسول سے کہا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (جو اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق حکومت کرو) (۵/۴۸)۔ اس سے اللہ۔ رسول اور اطاعت کرنے والوں میں ایک رابطہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اگر کسی سے کوئی لغزش ہو جائے تو اللہ سے اس کی معافی مانگنے کے لئے رسول کے پاس جائے گا رسول خدا کے قانون کو دیکھے گا کہ اسے کس قسم کی معافی مل سکتی ہے۔ کہا کہ دیکھنا رسول جو فیصلہ دے اس سے کہیں تمہارے دل میں گرانی نہ گذرنے پائے بلکہ اس فیصلے کے آگے جھک جاؤ جس طرح جھکنے کا حق ہے

(د) چوتھی کڑی۔ خدا کی رہنمائی صرف وقتی اور ہنگامی نہیں، قیامت تک کے لئے رہنے والی ہے۔

زمانے کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ اب قانون کی جزئیات ایسی ہو نہیں سکتیں کہ ہر بدلنے والے زمانے کا ساتھ دے سکیں اس لئے اللہ کے قانون میں مستقل اصول دے دیئے گئے اور جزئیات کو ہر زمانے کے لئے چھوڑ دیا گیا اور رسول سے کہا کہ معاملات میں باہمی مشورہ کر لیا کرو۔ اس سے وہ نظام قائم ہوتا ہے جس سے زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انسان شتر بے مہار بھی نہیں ہوتا کہ جس طرح جی چاہے قانون بناتا جائے۔ لیکن ان حدود کے اندر پوری آزادی دے دی ہے۔ دنیا میں جن قوموں نے جزئیات کو غیر متبدل قرار دے دیا وہ زمانے کے ساتھ نہ چل سکیں اور آخر میں انہوں نے مذہب کا جوا اتار کر Secular نظام سلطنت اختیار کر لیا۔

(۵) پانچویں کڑی۔ حضورؐ کے زمانے تک دنیا کا نظام شخصیتوں کے ساتھ بدلتا رہتا تھا۔ میدان جنگ میں سپہ سالار مارا گیا پوری قوم کو شکست ہو گئی۔ کوئی بادشاہ مارا گیا پوری قوم محکوم ہو گئی ایک شخصیت کے نہ رہنے سے پورا نظام ٹوٹ جاتا تھا۔ قرآن نے یہ کہہ کر تاریخ انسانیت کا رخ بدل دیا کہ نظام شخصیتوں کے ساتھ وابستہ نہیں۔ نظام اقدار کے ساتھ وابستہ ہے۔ چنانچہ افراد اور شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا۔ ختم نبوت میں بھی یہی حقیقت مضمر ہے۔ ختم نبوت کے سلسلہ میں قرآن نے کہا کہ فرد کی موت کے ساتھ نظام نہیں مرتا (۳/۱۴۴) چنانچہ حضورؐ کی وفات کے بعد بھی ایک Established form of Government قائم رہی۔ ایک Established government میں یکے بعد دیگرے نظام حکومت کو چلانے والے آتے رہتے ہیں۔ اور ہر Succesor کے وقت اس سے پہلی حکومت کے فیصلے بھی قائم رہتے ہیں اور By laws میں حسب ضرورت ترمیم بھی ہوتی رہتی ہے۔ یہی نقشہ حضورؐ کے بعد قائم رہا۔ یہی خلافت علیٰ منہاج رسالت تھی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد گاڑی دوسری پٹڑی پر آ پڑی۔ ملوکیت آ گئی۔ سیاست اور مذہب الگ الگ ہو گئے دین باقی نہ رہا۔ اللہ کے قانون کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت ہونے لگی۔ حج، روزہ، نماز، زکوٰۃ سب انفرادی چیزیں ہو گئیں، نکاح طلاق وغیرہ کے مسائل سے بادشاہوں کو دلچسپی نہ تھی چنانچہ وہ علماء کے حوالے کر دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب سلطنت میں وحدت تو رہ گئی۔ اور چیزوں میں وحدت نہ رہی۔ ہر عالم نے اپنی اپنی صوابدید کے مطابق نئے نئے احکام دینے شروع کر دیئے اور فرقے پیدا ہو گئے۔ اس اختلاف کو مٹانے کے لئے راستے کی تلاش شروع ہوئی تو نگاہیں قدرتاً رسول اللہؐ کی طرف جاتی تھیں۔ اطیعوا اللہ واطیعو الرسول۔ یہ وہ اطاعت تھی جسے حضورؐ نے اللہ کے احکام کے مطابق قائم کیا تھا۔ لیکن اب اطیعوا اللہ کے

معنی اللہ کی اطاعت ہوگئی اور اطیعوالرسول کے متعلق صحیح اسلامی نظام کے احیا کے بجائے کتب روایات کی طرف نظر جانے لگی۔ جب نظام ٹوٹ گیا تو سوال سامنے آیا کہ حضورؐ کے زمانے کی تاریخ بھی سامنے ہونی چاہیئے یہ اجتماعی نہیں بلکہ ایک انفرادی کوشش تھی اس لئے مختلف Schools of thought پیدا ہوگئے۔ خلافت علیٰ منہاج رسالت قائم نہ رہی۔ دین ایک انفرادی شے بن کر مذہب میں تبدیل ہوگیا۔ آج پھر فرقوں کو ختم کرکے نبی اکرمؐ کے دور کی طرف لوٹنے کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ ریاست اور مذہب کی ثنویت کو ختم کرکے پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت قائم کی جائے۔ اس سے پھر ہم خیر امۃ بن سکتے ہیں۔ اور اس سے پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے قابل ہوسکتے ہیں۔ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ ہماری اسلامی مشاورتی کونسل نے ابھی ابھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو رائج کرنے کے لئے صدر مملکت کے پاس سفارش کی ہے۔ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ موجودہ صورت میں اس فریضہ کو کون سرانجام دیگا اور کس طرح۔ صدر ایوب یا مولوی صدیقی۔ یا دونوں۔ ایک مسجد شاہ چراغ سے اور دوسرا ایوان صدر سے۔

برادران! یہ ہیں ان لاتعداد مسائل میں سے چند ایک مسائل جن کا محترم پرویز صاحب اپنے درس قرآن میں اکثر ذکر فرماتے رہے ہیں۔ آپ نے گذشتہ چند سالوں میں جن حقائق پر روشنی ڈالی گذشتہ ہزار برس سے ان پر پردے پڑے ہوئے چلے آرہے تھے۔ اگر ان حقائق کو یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں تیار ہوسکتی ہیں لیکن پرویز صاحب نے اس کام کو دوسروں پر نہیں چھوڑا وہ خود قرآن کی تعلیم کو کتابی شکل میں ترتیب دیتے چلے آرہے ہیں تاکہ آنیوالی نسلیں ٹامک ٹوئیے نہ مارتی پھریں کہ پرویز صاحب نے یہ کہا تھا اور وہ کہا تھا۔ تاہم متعدد چیزیں ایسی ہیں جو ابھی تحریر میں نہیں آئیں۔ میں چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ مسائل جو میں نے پرویز صاحب کی زبان اور قلم سے اخذ کئے ہیں ان کا مختصر خاکہ اس محفل میں پیش کروں۔ خاص کر قرآن کریم کے خلاف سازشوں کا موضوع بڑا اہم اور بڑا دلخراش ہے آپ نے جس انداز سے ایک ایک سازش کا انکشاف کیا وہ کسی دوسرے کے بس کا روگ نہ تھا۔ کشف و کرامات کے غیر قرآنی تصور کی دھجیاں بکھیر کر فالج زدہ قوم کی رگوں میں بجلی دوڑانا۔ مترفین کے طبقے کو قرآن کی رُو سے مجرموں کے کٹہرے میں لاکھڑا کرنا محترم پرویز صاحب ہی کا حصہ ہے۔ تصوف ایک ایسا تند و تیز دریا ہے جس میں شاعر مشرق جیسے عظیم المرتبت انسان کی کشتی بھی ڈگمگا کے رہ گئی لیکن جناب پرویز صاحب ایک مشاق ملاح کی طرح کشتی کو بلا تکلف اس بھنور سے نکال کر لے گئے۔ جی نہیں چاہتا کہ ان میں سے کسی ایک مسئلے کو بیان کئے بغیر آگے نکل جاؤں لیکن وقت بڑا کم ہے اور داستان بڑی

طویل اس لئے یہ حسرت دل میں لئے ہوئے جو کچھ کہہ چکا ہوں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

برادران! اگر اجازت ہو تو ایک مختصر سا قصہ بیان کروں۔ ہمارے جالندھر کا طلبع ایک مردم خیز خطہ ہوا کرتا تھا۔ عام لوگوں کے مذاق میں بھی شستگی پائی جاتی تھی۔ شہر کے اندر ایک زندہ دلوں کی بیٹھک تھی جہاں روزانہ شام کو لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ اور مختلف مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا تھا۔ علمی سطح تو بہت بلند نہ تھی لیکن چند ایک ذہین قسم کے لوگ وہاں موجود تھے۔ ایک مرتبہ قرآن کریم کی آیت (۵/۶۹) پر وہاں بحث چل نکلی۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـُٔوْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ - وہی چکر جس میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جیسا مشہور عالم دین بھی پھنسا رہا اور آخر دم تک نکل نہ سکا۔ محفل دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک حصہ اس کے حق میں تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں موجود ہیں اور دیگر مذاہب میں جو نیک لوگ موجود ہیں ان کے لئے بھی اسی طرح فلاح کا راستہ کھلا ہے جس طرح نیک مسلمانوں کے لئے ہے مثال کے طور پر ایک پڑوسی لالہ گوہر چند کا نام پیش کیا جاتا تھا جو حقیقتاً ایک نہایت دیانتدار اور پارسا انسان تھا۔ مخالف گروہ کے لوگ مصر تھے کہ یہ نظریہ غلط ہے کیونکہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر نبی اکرمؐ کی بعثت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ آپ یقین جانئے کہ یہ بحث دو دن نہیں۔ دو مہینے نہیں۔ بلکہ برسوں چلتی رہی اور بڑے زور دار طریقے سے چلتی رہی۔ لیکن چونکہ بات مذہب کی سطح پر ہوتی تھی اس لئے ایک جمود Stalemate کی شکل اختیار کر گئی۔ میرے ذہن میں بھی یہ مسئلہ مدتوں صاف نہ ہو سکا تا آنکہ محترم پرویز کی بصیرت قرآنی مدد کو پہنچی۔ پرویز صاحب مسئلہ کو مذہب کی سطح سے اٹھا کر دین کی سطح پر لے آئے اور اس کا حل فوراً سامنے تھا آپ نے واضح کیا کہ قرآن افراد کی اصلاح اور معاشرے کی اصلاح کے لئے مختلف قوانین دیتا ہے۔ انفرادی اصلاح سے چند اصلاح یافتہ لوگ اپنے محدود ماحول میں تو حسن پیدا کر سکتے ہیں لیکن اس عالمگیر Evolution by process کا جزو نہیں بن سکتے جو انسانیت کو ایک منزل مقصود کی طرف لئے جا رہا ہے۔ جس مذہب کے اصول اللہ کی دی ہوئی مستقل اقدار سے ٹکراتے ہوں اس کے نیک افراد پوری انسانیت کی بہبود کا موجب نہیں بن سکتے۔ مثال کے طور پر ہندو مت میں ایک شودر کا بچہ چاہے کتنی ہی صلاحیتیں کیوں نہ رکھتا ہو وہ برہمن کے برابر نہیں ہو سکتا وہ پیدائش کے اعتبار سے ہمیشہ محکوم ہے۔ جس معاشرے کے اصول یہ ہوں وہ عالمگیر انسانیت کی فلاح کی طرف قدم نہیں اٹھا سکتا چاہے اس میں کتنے ہی بظاہر نیک اور پارسا

لوگ موجود ہوں۔۔۔ کتنا خوبصورت حل ہے۔

برادران! ہوسکتا ہے کہ قرآنی حقائق کا جو مفہوم محترم پرویز کرتے رہے ہیں اس سے بعض لوگوں کو اختلاف ہو لیکن میں آپ کے بیان کردہ مفہوم کی صحت اور محکمیت کے حق میں ایک دلیل پیش کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی چیلنج کرتا ہوں کہ کوئی اس دلیل کو رد کرے۔ وہ دلیل یہ ہے کہ ہمیشہ سے اپنے اور بیگانے یہی کہتے چلے آئے ہیں کہ قرآنی آیات کی ترتیب میں ربط نہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ قرآن کریم کے کسی ترجمے کو اٹھا کر دیکھئے قرآن میں کہیں ربط نظر نہیں آتا۔ یہ اس لیے کہ مخالفین قرآن نے اس میں ربط رہنے نہ دیا اور حاملان قرآن نے اس میں ربط ڈھونڈنے کی کبھی کوشش نہ کی یہ صرف پرویز صاحب کے مفہوم القرآن کا اعجاز ہے کہ جہاں دوسرے تراجم میں کہیں ربط نظر نہیں آتا وہاں مفہوم القرآن میں کہیں بے ربطگی نظر نہیں آتی۔ یہ آپ کے بیان کردہ مفہوم کی صحت کی ایک کھلی نشانی ہے جس کا جی چاہے اٹھا کر دیکھ لے۔ ایک صاحب جو بھاری بھرکم سیاسی لیڈر بھی تھے اور قرآن فہمی میں بھی اچھی شہرت رکھتے تھے آج سے قریباً چالیس برس پیشتر انہوں نے ایک کتاب لکھی جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا میں نے سنہ ۱۹۲۷ء میں پہلی مرتبہ وہ کتاب پڑھی اور اس سے بے حد متاثر ہوا اس لئے کہ قرآن کا قانون مکافات عمل پہلی مرتبہ اس کتاب میں میری نظر سے گذرا تھا لیکن جب میں نے کتاب کے مصنف سے ایک بار سوال کیا کہ قانون مکافات عمل کی موجودگی میں دعا کی کیا حیثیت ہے تو وہ آئیں بائیں شائیں کرکے رہ گئے۔ برس ہا برس یہ سوال میرے ذہن میں چبھ کر کانٹا رہا آخر اس کا حل پرویز صاحب کی لغات القرآن میں ملا۔ یہی صاحب جن کا اوپر ذکر کر چکا ہوں اور جو ساری عمر علامہ بھی کہلواتے رہے اپنی موت سے پہلے ایک کتاب لکھ گئے۔ اس کتاب کا سب سے اہم باب اس موضوع پر ہے کہ قرآن میں ربط نہیں ہے۔ اے کاش! مرحوم اس کتاب کو لکھ کر یہ کلنک کا ٹیکہ اپنے ساتھ نہ لے جاتے۔

قرآن خود کہتا ہے کہ میں ایک بیّن کتاب ہوں اور وہ آیات کو پھیر پھیر کر سامنے لاتا ہے تاکہ مفہوم صاف ہو جائے۔ لیکن تصریف آیات سے بہت کم مفسروں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ عام طور پر قرآنی مفہوم کو روایات کے سہارے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے قرآن میں ربط نہ رہا۔ لیکن محترم پرویز صاحب نے تصریف آیات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور قرآنی مفہوم کو قرآن ہی سے واضح کرنے میں ایک آرٹ کی شکل دے دی ہے۔

لغات القرآن

برادران! یوں تو پرویز صاحب کی ہر کتاب اپنا ایک مقام رکھتی ہے لیکن آج اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ پرویز صاحب کی کونسی کتاب زیادہ اہم ہے تو میں کہوں گا کہ ایک طالب علم قرآن کے لئے لغات القرآن سے زیادہ مفید کتاب کوئی نہیں۔ جو بات کسی دوسری جگہ صاف نہ ہو وہاں لغات القرآن مدد کرتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لئے بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن یہاں صرف ایک چھوٹی سی مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ سورہ ہود میں ہے وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ (۱۱/۹) یعنی کسی انسان کو ہم اپنی نعمت دینے کے بعد چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید ہو جاتا ہے۔ یہاں لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ۔ کے الفاظ میرے سامنے تھے۔ ایک جگہ اس کا ترجمہ لکھا تھا ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے اس لئے بات واضح نہیں ہوتی کہ کفور کا لفظ یہاں کیوں آیا ہے ایک انگریزی ترجمے میں لکھا تھا He is in despair and falls into blasphemy یہ بھی قطعاً غیر تسلی بخش ہے۔ مفہوم القرآن میں بھی اس کا ترجمہ لکھا ہے۔ وہ زندگی سے یکسر مایوس ہو جاتا ہے، درس میں جب یہ آیت آئی تو پھر بھی یہ بحث سامنے نہ آئی۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ والی آیت پڑھی نظر میں تھی لیکن یہ تو ایک Advice ہے۔ اس سے بات آگے نہیں بڑھتی تھی۔ یہ ہدایت تو کی جا سکتی ہے کہ ناامید نہ ہو لیکن ناامیدی کو کفر کیوں قرار دیا۔ آخر کسی شے کو کفر قرار دینا معمولی بات نہیں۔ چنانچہ میں نے لغات القرآن کی طرف رجوع کیا اور میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہاں نہایت حسین انداز میں اس پر بحث موجود ہے کہ یاس اور کفر کا باہمی تعلق کیا ہے۔ پہلے تو وہاں یہ Clear cut آیت سامنے آئی کہ اللہ کی رحمت سے سوائے کافروں کے کوئی ناامید ہو ہی نہیں سکتا۔ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۲/۸۷) پھر وہاں یہ ملتا ہے کہ مومن وہ ہے جو علیٰ وجہ البصیرت خدا کے قوانین کی حکمت نتیجہ خیزی اور صداقت پر یقین رکھتا ہے وہ اس یقین کے ساتھ اس راستے پر گامزن ہوتا ہے اگر اسے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا اپنی غلطی سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے تو اپنی روش کی صداقت اور حکمت پر یقین اسے بددل نہیں ہونے دیتا۔ وہ سنبھلتا ہے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے اور اپنی غلطی کا ازالہ کر کے پھر اسی راستے پر چل پڑتا ہے۔ ناامید وہ ہوتا ہے جو کسی راستے کو قیاس اور گمان پر "تجربۃً" اختیار کرتا ہے۔ جب اسے ناکامی ہوتی ہے تو وہیں رک جاتا ہے۔ اس میں دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب مصائب میں گھرتا ہے لیکن

اسے اپنی ذات پر اعتماد ہوتا ہے تو وہ اسے محض طبعی حالات کی مجبوری سمجھتا ہے۔ اور اپنے اندر شکست خوردگی کا احساس پیدا نہیں ہونے دیتا اس کے برعکس جو شخص اپنے اوپر بھروسہ نہیں کرتا۔ جس کا اپنی ذات پر ایمان نہیں ہوتا۔ وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ مادی نظریہ حیات میں چونکہ سارا انحصار خارجی اسباب و ذرائع پر ہوتا ہے اس لئے جب وہ اسباب و ذرائع ختم ہو جاتے ہیں تو انسان مایوس ہو جاتا ہے لیکن انسانی ذات کی ممکنات کی انتہا نہیں اس لئے جس شخص کا انسانی ذات پر ایمان ہوتا ہے وہ کسی مقام پر بھی یہ نہیں کہتا کہ اس سے آگے میں کچھ کر سکنے کے قابل نہیں وہ صرف یہی کہے گا کہ سر دست میرے پاس اس کے لئے مادی وسائل نہیں ہے وہ اپنی ذات سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ کفر دراصل اپنی ذات سے انکار ہے اور اس کے بعد مکمل تر ذات خداوندی سے انکار ۔ برادران! کس حسن و خوبی کے ساتھ مسئلہ حل ہوا ہے۔ لائیے کوئی بڑے سے بڑا مفسر قرآن جس نے اسے یہ حسن عطا کیا ہو؟

برادران!۔ پیشتر اس کے کہ میں اپنی گذارشات کو ختم کروں میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کہ محترم پرویز صاحب کا باقاعدہ درس قرآن ۱۸ ستمبر ۱۹۶۰ء کو شروع ہوا تھا۔ گذشتہ قریباً پانچ برس میں ہزاروں لوگ آپ کے درس سے مستفید ہوئے۔ اس طویل عرصے میں کچھ ایسے بھی تھے جو اللہ کو پیارے ہو گئے خدا انہیں غریق رحمت کرے۔ کچھ اپنی دنیاوی مصروفیات کی وجہ سے آتے بھی رہے اور جاتے بھی رہے۔ کچھ اپنے ارادے اور دھن کے پکے مستقل طور پر درس میں حاضری دیتے رہے مجھے بھی بعض اوقات میری دیگر مصروفیات نے درس میں عدم شمولیت پر مجبور کیا۔ دوسرے مستقل طور پر حاضر ہونے والے اصحاب بھی کبھی کبھار ناغہ کرتے رہے۔ لیکن جس شخص نے کبھی ناغہ نہ کیا اور اگر مجبوراً کبھی اتوار کے روز باہر جانا پڑا تو اس پر دل کی گہرائی سے اظہار افسوس کیا وہ خود محترم پرویز صاحب تھے۔ اس اثنا میں مخالفت کی تند و تیز ہوائیں بھی چلتی رہیں۔ لیکن جب بھی کوئی مخالفت کا جھکڑ اٹھا بجائے دبنے کے محترم پرویز صاحب کی پرواز اور بلند ہو گئی۔ حق آتا رہا اور باطل جاتا رہا۔

اے محترم پرویز! تو نے ہمیں علم قرآن کی دولت سے مالا مال کیا۔ تو نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم اپنے آپ کو پہچان سکیں اپنی ذات کی نگہداشت کر سکیں۔ اللہ تعالےٰ دنیا اور آخرت میں تیری نگہبانی کرے۔ یہ قرآن کریم پہلے بھی ہمارے ہر گھر میں موجود تھا لیکن تیری بصیرت قرآنی ہمیں ظلمات سے نکال کر نور کی طرف لے

آئی اللہ تیرے علم و بصیرت کو اور زیادہ کرے اور اللہ کی رحمتیں قدم قدم پر تیرے شامل حال ہوں۔ یہ تیرا دوسروں کی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کا جذبہ۔ نوع انسان کی بہبود کے لئے تیری دن رات کی مسلسل محنت۔ تیری ان تھک کوشش۔ تیری ہمت۔ تیرے عزم اور تیرے صبر و استقلال کا نتیجہ ہے جو ایک لہلہاتے صدا بہار باغ کی شکل میں آج تیرے سامنے ہے۔ ہم طالبان علم قرآن کے لئے ممکن نہیں کہ تیری سعی و عمل کے بدلے میں کچھ پیش کر سکیں۔ اس کی جزا تیرے اللہ کے پاس ہے۔ ہم آج صرف یہ کہنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں کہ اے محترم پرویز! سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (۱۳/۲۴)

کالج فنڈ

عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دے دیئے گئے

مرکزی حکومت پاکستان (سنٹرل بورڈ آف ریونیو) نے بموجب اپنی چٹھی نمبری S.179(69)-ITP/65 مورخہ ۶ اگست ۱۹۶۵ء قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کو انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء کی دفعہ 15-D سے مستثنیٰ قرار دیدیا ہے۔ کالج فنڈ اکٹھا کرنے والے احباب عطیہ جات دینے والے حضرات کو اس سے مطلع کر دیں۔

۲۔ طلوع اسلام کنونشن وسط اکتوبر تک منعقد ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ تمام بزمیں اپنے ذمہ لی ہوئی رقوم کو اس وقت تک فراہم کر لیں گی۔ جن حضرات نے اس سلسلہ میں وعدے کئے تھے ان سے بھی درخواست ہے کہ کنونشن سے پہلے پہلے انہیں ایفا کر دیں۔

یاد رکھئے! مجوزہ کالج، ہماری ملت کا ایک تاریخی اقدام ہوگا۔

(مرزا) محمد خلیل۔
خزانچی۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔

۲۵۔ بی۔ گلبرگ ۲
لاہور۔

تشکر اور تاثر

(محترم مرزا محمد خلیل صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام لاہور)

برادران عزیز!

میں نمائندہ بزم طلوع اسلام کی حیثیت سے آپ حضرات کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اسٹیج پر آنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھ سے کہا گیا ہے کہ محترم پرویز صاحب کے پرانے قدیم ترین رفقا ہونے کی جہت سے مجھے بھی اپنے تاثرات پیش کرنے چاہئیں۔ میرے تاثرات ویسے تو اس بات سے ظاہر ہیں کہ کم و بیش تیس سال سے مسلسل محترم پرویز صاحب کی قرآنی فکر سے متاثر چلا آرہا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس تاثر کی شدت اور گہرائی کم نہیں ہو رہی بلکہ ترقی پذیر ہے۔ لیکن ایک اور سعادت جو میرے حصہ میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ میں نے محترم پرویز صاحب کی قرآنی فکر کے ساتھ ساتھ اُن کی عملی زندگی کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اور میں فخر اور اعتماد کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کا کوئی راز ایسا نہیں جس سے میں واقف نہ ہوں بلکہ اصل تو یہ ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی راز ہے ہی نہیں وہ بالکل آئینے کی طرح سامنے ہے۔ میں جسقدر ان کی فکر سے متاثر ہوا ہوں اُسی قدر ان کی زندگی سے متاثر ہوں اور ان دونوں تاثرات کا نتیجہ ہے کہ مجھے قرآن کریم کی تعلیم سے متواتر وابستگی اور شغفگی رہی ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ العزیز رہے گی۔ اور یہ ایسا احسان عظیم ہے جس کے شکریہ کے لئے میرے پاس الفاظ ہی نہیں جن سے کما حقہٗ اس جذبہ کا اظہار کر سکوں۔

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے سابقہ کنونشن میں دعا مانگی تھی کہ محترم پرویز صاحب کم از کم اُس وقت تک ضرور زندہ رہیں جب تک خود ڈاکٹر صاحب زندہ ہیں۔ بڑی حسین تھی ان کی یہ دعا! لیکن میں محترم پرویز صاحب کے ان فیوض کو اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتا۔ اس لئے میری دعا ہے کہ

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

اس کے بعد میرے عزیز بھائیو اور بہنو۔ میں ان احباب کا بھی بدل شکر گذار ہوں۔ جنہوں نے اس تقریب کے انعقاد میں ہمارا ہاتھ بٹایا ہے۔ اور ان حضرات کا بھی جنہوں نے اس طرح آج شرکت فرما کر اسے کامیاب بنانے کی کوشش فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی میں اپنے رفقائے کار۔ یعنی اراکین بزم طلوع اسلام کا بھی منت کش ہوں جنہوں نے اس حسن کارانہ انداز سے اس تقریب کو کامیاب بنایا۔ میں محترم ڈاکٹر صاحب کا بصمیم قلب سپاس گذار ہوں کہ وہ اس جشن کے محرک ہو کر ہم سب کے لئے باعث مسرت ہوئے۔ اور آخر میں۔ اپنی طرف سے اور آپ تمام احباب کی طرف سے بدرگاہ رب العزت سجدہ ریز ہوں کہ اس نے ہمیں اپنی کتاب عظیم کو صحیح صحیح انداز سے سمجھنے کے لئے یہ موقعہ بہم پہنچایا اور یوں ہمیں تاریکیوں سے روشنی کی طرف آنے کی سعادت عطا فرمائی۔ اسی سے ہم اب استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں توفیق عنایت فرمائے کہ ہم قرآن فہمی کی اس منزل کا دوسرا نصف حصہ بھی اسی جذب و کیف سے طے کرنے کے قابل ہو سکیں۔

یارب ایں آرزوئے من ہمہ خوش است

پرویز صاحب کی خدمت میں جو تحائف ابھی ابھی پیش کئے گئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) بزم کراچی کی طرف سے ایک ٹیپ ریکارڈر۔ درس ریکارڈ کرنے کے لئے۔

(۲) بزم لاہور کی طرف سے ایک قلم۔ اور درس کے لئے ایک بجلی کا پنکھا۔

(۳) محترم زرین خان صاحب کی طرف سے قرآن کریم کا ایک حسین نسخہ۔

(۴) محترم شیخ محمد شریف صاحب کی طرف سے ایک مرقع جس میں انہوں نے پرویز صاحب کی قرآنی فکر کو متلاطم سمندر میں روشنی کے مینار

کی شکل میں پیش کیا ہے۔

(۵) ارکان بزم طلوع اسلام لاہور۔ اور درس میں شرکت کرنے والے دیگر احباب کی طرف سے مشترکہ طور پر ایک ہزار ایک روپیہ جس سے درس گاہ کے لئے فرنیچر تیار کرایا جائے گا۔

اور سب سے بڑھ کر ان سینکڑوں افراد کی طرف سے مخلص دعائیں اور حسین ترین تمنائیں جن کی کوئی قیمت ہی مقرر نہیں کی جا سکتی۔

آخر میں آپ تمام احباب کا ایک بار پھر دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

والسلام

(مرزا محمد خلیل)

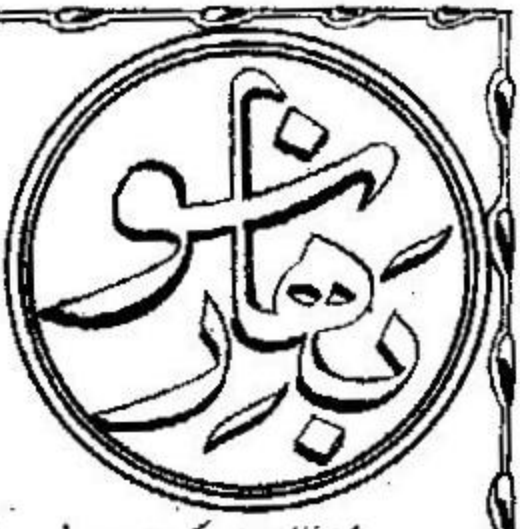

ادارہ طلوع اسلام کی تازہ پیشکش

بہارِ نو

پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مضامین وتقاریر کا

تیسرا مجموعہ

سابقہ شائع شدہ دو پہلے مجموعوں —

"فردوس گم گشتہ" و

"سلسبیل" کے

سائز ۲۷/۱۷ کے ۳۰۴ صفحات پر مشتمل۔ عام اشاعت کی غرض سے اسے چیپ ایڈیشن کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔

قیمت فی جلد ——— پانچ روپے

۲- پیشگی خریداروں کو یہ کتاب عنقریب ارسال کی جا رہی ہے۔

۳- اپنی فرمائشیں جلد بھیجئے تاکہ کتاب ملنے میں تاخیر نہ ہو۔

ملنے کا پتہ:-

ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

بابُ المُراسلات

اطاعت کا مفہوم

ایک صاحب لکھتے ہیں۔

اگست کے پرچے میں آپ نے سورۂ نساء کی آیت۔ فلا و ربک لا یؤمنون ...... الخ درج کی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک رسول اللہ کو اپنے معاملات میں حکم تسلیم نہ کریں اور پھر ان کے فیصلوں کے خلاف دل میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کریں۔ اس کے باوجود آپ نے حضرت زیدؓ کا واقعہ درج کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ کے فرمانے کے باوجود اپنی بیوی کو طلاق دیدی۔ لیکن اسے معصیتِ رسول نہ سمجھا گیا کیونکہ آپؐ نے ایسا اپنی ذاتی حیثیت سے فرمایا تھا۔ اس سے حسب ذیل سوالات دل میں ابھرتے ہیں۔

(۱) ہماری کتب احادیث میں رسول اللہ کے کسی ارشاد کے ساتھ یہ تصریح نہیں ہوتی کہ اس بات کا حکم حضورؐ نے اپنی کس حیثیت سے دیا تھا۔ اس سے ایک تو یہ واضح ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا ہر قول وحیٔ خداوندی تھا۔ جس کی اطاعت واجب تھی' ان کا یہ کہنا صحیح نہیں۔ دوسرے یہ کہ جن احادیث کے متعلق یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ صحیح ہیں' ان کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ آپؐ نے وہ حکم اپنی ذاتی حیثیت سے بطور مشورہ دیا تھا یا کسی اور حیثیت سے۔ اس لئے احادیث کی رُو سے متعین طور پر اطاعت رسول اللہ کیسے کی جا سکتی ہے ؟

(۲) دوسرے یہ کہ رسول اللہ کے فیصلے کے خلاف اگر کسی کے دل میں بھی کوئی گرانی محسوس ہو' تو وہ شخص مومن نہیں رہتا۔ کیا یہ حیثیت کسی اور کو بھی حاصل ہو سکتی ہے ؟

(۳) ہم اپنے کئی معاملات میں' دوسروں کے فیصلوں کو صحیح نہیں سمجھتے لیکن اس کے باوجود

متعدد وجوہات کی بنا پر، ان فیصلوں کو مان لیتے ہیں حالانکہ دل اس پر کڑھتا رہتا ہے۔ مثلاً کسی زبردست کے ڈر سے۔ یا اپنے کسی بڑے کے احترام کی وجہ سے۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ اطاعت کیسی ہوگی ؟

جواب

(۱) آپ نے صحیح سمجھا ہے۔ سنت کے سلسلہ میں اسی قسم کی دشواریاں ہیں جنہیں ہم مدت سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان کا اطمینان بخش جواب تو کہیں سے ملتا نہیں البتہ "منکر حدیث" اور "منکر رسالت" کے فتوے ضرور صادر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس طرح یہ مسائل حل تو ہو نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ برسوں کی تگ و تاز کے باوجود ایسے قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکے (نہ ہی کبھی ہو سکتے ہیں) جنہیں یہ حضرات متفقہ طور پر مطابق "کتاب و سنت" قرار دیں۔ اس لئے کہ جب یہ حضرات متفقہ طور پر ہی طے نہیں کر سکتے کہ "سنت" کا اطلاق کس پر ہوتا ہے، تو اس کا فیصلہ کس طرح کر سکتے ہیں کہ فلاں فیصلہ مطابق سنت ہے یا نہیں۔

(۲) اس سلسلہ میں پہلے یہ دیکھئے کہ ایمان کہتے کسے ہیں ؟ ایمان کے معنی ہیں کسی بات کو دل کی پوری پوری رضامندی کے ساتھ صحیح تسلیم کر لینا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کسی بات کے تسلیم کرنے میں دل کی رضامندی شامل نہ ہو (دل میں اس کے خلاف گرانی پائی جائے) تو اسے ایمان کہا ہی نہیں جائے گا۔

دوسرے یہ کہ نبی پر ایمان لانے کے کیا معنی ہیں ؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس بات کو دل کی پوری پوری رضامندی کے ساتھ تسلیم کیا جائے کہ (۱) نبی خدا کے احکام کو صحیح صحیح طور پر ہم تک پہنچاتا ہے۔ اور (۲) اس کے فیصلے احکام خداوندی کے مطابق ہوتے ہیں۔ نبی پر ایمان لانے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے کسی فیصلے کے خلاف اگر دل میں گرانی محسوس ہو، تو یہ بات نبی پر ایمان کے خلاف ہوگی۔

نبی کے علاوہ، ہم کسی انسان پر ایمان لانے کے لئے مکلف نہیں ہوتے۔ اس لئے یہ پوزیشن کسی اور کی نہیں ہو سکتی کہ اس کے فیصلے کے خلاف دل میں گرانی گذرے تو انسان کا ایمان جاتا رہے۔

البتہ ایک بات قابل غور ضرور ہے۔ ایک شخص آپ کے سامنے قرآن کریم کا کوئی فیصلہ پیش کرتا ہے۔ اسے آپ تسلیم تو کر لیتے ہیں لیکن دل کی کبیدگی کے ساتھ۔ آپ کی یہ کبیدگی، اس شخص کے خلاف نہیں ہوگی بلکہ درحقیقت قرآن کریم کے خلاف ہوگی۔ اور قرآن کریم پر ایمان لانے کیلئے

ہم مکلف ہیں۔ اس لئے یہ چیز اُس ذیل میں آجائے گی۔ البتہ اگر صورت یہ ہے کہ وہ فیصلہ قرآن کریم کے کسی اصول کے ماتحت اُس شخص کا (یا کسی اور کا) اپنا استنباط ہے، اور آپ اس سے متفق نہیں، تو اس کے خلاف دل میں کبیدگی پیدا ہو جانا خود قرآن کریم کے خلاف کبیدگی پیدا ہونے کے مرادف نہیں ہو گی۔

(۳) جن لوگوں کے فیصلوں کی اطاعت ہم کرتے (مجبوراً) کرتے ہیں (خواہ وہ مجبوری کسی قسم کی ہو۔ خود اپنے کسی مفاد کا خیال بھی تو مجبوری ہوتی ہے) اول تو اس کے لئے "اطاعت" کا لفظ ہی استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ "اطاعت" اس فرماں پذیری کو کہتے ہیں جس میں دل کی رضامندی شامل ہو۔ لیکن ایسی "اطاعت" کے لئے جس میں دل کی رضامندی شامل نہ ہو احترام کا لفظ تو بالکل استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ احترام، اُس تعظیم کو کہتے ہیں جو دل کے پورے خلوص اور رضامندی کے ساتھ کی جائے۔ اگر آپ کسی کے فیصلے کے خلاف دل میں کبیدگی محسوس کرتے ہیں لیکن اسے کسی مصلحت کے تابع مان لیتے ہیں۔ مثلاً کسی کے ڈر کی وجہ سے۔ یا کسی کی ناراضگی کے خیال سے۔ تو یہ کہیئے کہ میں نے اسے مصلحتاً تسلیم کر لیا، لیکن اگر آپ یہ کہیں گے کہ میں نے ان کے احترام کی وجہ سے اسے مان لیا، تو اس سے آپ ایسے جذبہ کا اظہار کر رہے ہیں جو فی الحقیقت آپ کے دل میں نہیں۔ یہ "احترام" ایسا ہی ہے جیسا ہمارے ہاں رمضان شریف کا "احترام" کیا جاتا ہے کہ دل میں یہ جذبات موجزن ہوتے ہیں کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی اور زبان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اس کے احترام میں لوگوں کے سامنے نہیں کھاتے پیتے۔ احترام اُس کا ہے جو رمضان کے روزوں کو خدا کا حکم سمجھے اور اس حکم کے خلاف دل میں کوئی کبیدگی محسوس نہ کرے۔ لیکن (خدا ہی کی دی ہوئی اجازت کے ماتحت) اپنی کسی معذوری کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے، اور حکم خداوندی کی تعظیم کے جذبہ کے ماتحت، کھلے بندوں نہ کھائے پیئے، اِلّا بحالتِ مجبوری۔ احترام اس شخص کا ہے کہ وہ کسی کے فیصلے کو اپنے کسی فائدے یا دل کے رجحان کے خلاف ہی کیوں نہ پائے لیکن اس کے باوجود اس بات پر یقین رکھنے کی وجہ سے کہ وہ حق و باطل اور غلط اور صحیح کو مجھ سے بہتر سمجھتا ہے، اس فیصلہ کے خلاف دل میں کوئی کبیدگی محسوس نہ کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اُس سے اس فیصلہ کی سند یا علت دریافت کر کے اپنا مزید اطمینان کرے۔ جہاں یہ بات نہ ہو وہاں مصلحت ہوتی ہے۔ احترام نہیں ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ جب لوگوں کی حالت یہ ہو جائے کہ دل اور زبان میں ہم آہنگی نہ رہے،

تو پھر وہ زبان سے ایسے الفاظ بولتے ہیں جو دل کے جذبات کی ترجمانی کے لئے وضع ہوئے تھے حالانکہ اُن کے دل کے جذبات ان الفاظ کی تائید نہیں کر رہے ہوتے۔ یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم (وہ زبان سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہوتا)۔ لیکن جب کسی معاشرہ میں الفاظ اپنا حقیقی مفہوم ہی کھو بیٹھیں، تو وہ معاشرہ (یوں سمجھئے کہ) زبان ہی کوئی دوسری بولنے لگ جاتا ہے۔ اس صورت میں اس معاشرہ کو اپنے ہاں کے مروجہ الفاظ کے معانی کے لئے لغات بھی نئی مرتب کرنی چاہئے تاکہ کسی کو لفظوں سے دھوکا نہ لگ سکے۔ (لیکن یہ بحث الگ ہے اور ہمارے زیرِ نظر موضوع سے ہٹی ہوئی)۔

مومن، قرآنی مملکت کے فیصلوں کی (صحیح معنوں میں) اطاعت کرتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے احکام کی اطاعت کراتی ہے۔ اور اس وجہ سے اس کا ان کے دل میں احترام ہوتا ہے۔ انہیں اگر کسی فیصلہ کی صحت کے بارے میں کچھ شبہ گذرے تو وہ اپنے اطمینان کی خاطر مملکت سے اس کی وضاحت کرا لیتے ہیں۔ اور اگر مملکت دیکھے کہ اس سے سہو ہو گیا ہے تو وہ فوراً اپنی اصلاح کر لیتی ہے۔

خدا کیا ہے

اُسے ماننا کیوں ضروری ہے؟ ماننے سے کیا ملتا ہے؟ نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے؟

زندگی کے ان اہم ترین سوالوں کا علیٰ وجہ البصیرت جواب

من و یزداں

(میں دیکھئے)

مفکرِ قرآن کی اس اہم کتاب کا مطالعہ زندگی کے ان اہم حقائق کو روشنی میں لاتا ہے جو نوعِ انسانی کے لئے چیستاں بنے چلے آ رہے ہیں۔

علاوہ بریں یہ بھی تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ تقدیر کیا ہے؟ مشیتِ خداوندی کے قانون کی حقیقت کیا ہے؟ دعا کیا اثرات مرتب کرتی ہے؟

قیمت ——— دس روپے

بچوں کا صفحہ

آزادی

بشیر بڑا کھلنڈرا لڑکا تھا۔ ۱۴ راگست کو یوم آزادی کی جو چھٹی ملی تو صبح ہی صبح گھر سے نکلا۔ راستے میں اس کا دوست صغیر ملا۔ اس نے پوچھا کہ آج صبح ہی صبح کہاں کے ارادے ہیں؟ کہنے لگا کہ "بابا! ارادے کیا ہیں۔ مہینوں گذر جاتے ہیں کہ آزادی کا سانس نصیب نہیں ہوتا۔ صبح ہی صبح اٹھنے کی پابندی پھر وقت پر کام پہ جانے کی پابندی۔ دن بھر نیکڑی کی پابندی۔ میرا تو پابندیوں سے جی گھبراتا ہے۔ آج خدا خدا کرکے چھٹی ملی ہے۔ بس سارا دن اپنی من مانی کرونگا۔ شام کو ہمارا فٹ بال کا میچ بھی ہے۔"

صغیر شام کے بعد بشیر سے ملا تو اس نے پوچھا کہ فٹ بال میچ کا کیا ہوا؟ کہنے لگا کہ ہوا کیا! بس یوں سمجھ کہ فساد ہوتے ہوتے بچ گیا۔ پہلے ہاف ٹائم میں ہم نے دو گول کئے۔ دوسرے ہاف میں ان سے کوئی گول نہ ہو سکا تو انہوں نے فاؤل کھیلنا شروع کر دیا۔ بال لائن سے باہر ہے لیکن وہ پھر بھی کِک لگائے جا رہے ہیں۔ ہینڈ بال ہوگیا تو اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ ریفری سیٹی پر سیٹی دے رہا ہے، لیکن وہ سنتے ہی نہیں۔ نہ کسی قاعدے قانون کی پابندی۔ نہ ریفری کے فیصلے کی پرواہ۔ اسے کھیل کہتے ہیں یا دھاندلی! جھگڑے سے بچنے کیلئے ہم نے کھیل ختم کر دیا اور گھر کو چلے آئے۔

بشیر نے کہا کہ تم تو صبح کہتے تھے کہ پابندیوں سے تمہارا ناک میں دم آگیا ہے۔ آزادی کے معنی یہ ہیں کہ انسان من مانی کرے۔ لیکن اب تم کہتے ہو کہ اس ٹیم نے کسی قاعدے قانون کی پابندی ہی نہیں کی۔ وہ من مانی کرتے چلے گئے۔ یہ کھیل نہیں دھاندلی ہے۔ تو میرے بھائی! جس آزادی میں قاعدے قانون کی پابندی نہ ہو وہ آزادی نہیں، دھاندلی ہوتی ہے۔ اس بات کو یاد رکھوگے تو پھر تمہیں قاعدے اور ضابطے کی پابندی سے گھبراہٹ نہیں ہوگی۔

یہ بات صغیر کی سمجھ میں آگئی۔ بات تھی ہی سمجھ میں آنے والی!

(ایڈیٹر صفدر سلیمی۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لاہور)